www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ

Al-Risala

November-December 2025 • Rs. 50

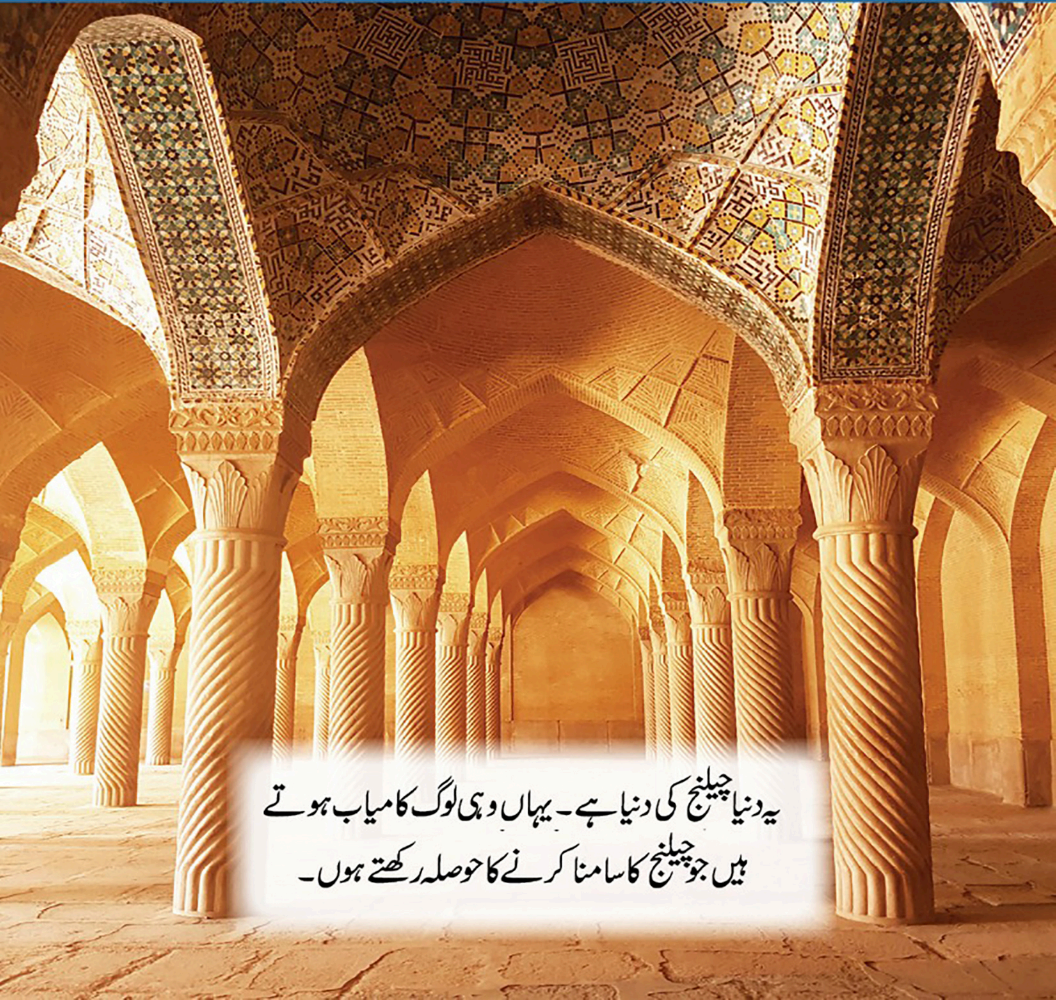

یہ دنیا چیلنج کی دنیا ہے۔ یہاں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو چیلنج کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Nov-Dec 2025 | Volume 50 | Issue 6

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr. Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: info@goodwordbooks.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹ 40 per copy
Subscription by Book Post	₹ 200 per year
Subscription by Regd. Post	₹ 400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Saniyasnain Khan
State Bank of India
A/c No: 30087163574
IFSC Code: SBIN0009109

UPI
UNIFIED PAYMENTS INTERFACE

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدّین خاں

فہرست

شارٹ کٹ نہیں	4
تقویٰ کی علامت	5
قربتِ خداوندی	7
محبت کا نذرانہ	8
اللہ سے حُبِّ شدید	9
رسول کو ماننا	11
فقدانِ معرفت کا دور	12
اطاعتِ رسول	13
قومی بے عزتی یا محبتِ رسول	14
متعصّبانہ طرزِ فکر	15
انسان کا مقصدِ تخلیق	16
شیطان کا مقابلہ	18
تزئین کیا ہے	19
فطرت کا عمل	20
بڑھاپے کا سبق	21
کنفیوزن کیوں	22
دفع کا قانون	23
دجال کا فتنہ	26
آیات کا ظہور	31
یہود کی مثال	34
بامقصد زندگی	36
طریقِ مطالعہ	37
قربانی، تصحیحِ فکر	38
لکھنے کا کلچر	39
لو پروفائل، ہائی پروفائل	40
ڈائری 1986	42
ایک انٹرویو	46
ایمان کا لباس	48
خبرنامہ اسلامی مرکز	49

क़ुदरत का सबक़	1
बोलने की शर्त	4
दो तरीक़े	5
एकता की मसिाल	6
सादा पहचान	8
एक सरदार की खूबियाँ	9
मुजरमि कौन	9
तहक़ीक़ ज़रूरी	11
न्यायप्रियता	11
जनता और शासक के बीच क़ानूनी बराबरी	13
खुदा के हुक्म के आगे झुक जाना	16

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

شارٹ کٹ نہیں

زیرنظر شمارہ 2025 کا آخری شمارہ ہے۔یعنی نئے سال کے موقع پر یہ شمارہ آپ قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا۔ یہ بات سوچتے ہوئے انگریزی زبان کا ایک مقولہ مجھے یاد آیا، وہ مقولہ یہ ہے— دو پوائنٹس کے درمیان شارٹ کٹ سب سے لمبی دوری ہے:

A shortcut is the longest distance between two points.

ایک سال کا گزرنا سادہ طور پر پرانے کیلنڈر کو ہٹا کر نئے سال کا کیلنڈر لگانے کی مانند ایک لمحے کا واقعہ نہیں ہے۔ یہ ایک طویل عمل ہے، جو انگریزی کیلنڈر کے مطابق 365 دنوں میں مکمل ہوتا ہے۔ یہی معاملہ انسان کی کامیابی کا ہے۔کسی انسان کے لیے درست پلاننگ اور محنت اس وقت نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے، جب کہ وہ صبر کے ساتھ انتظار کا طریقہ اختیار کرتے ہے۔ یہی فطرت کا قانون ہے۔مگر انسان اکثر حالات میں فوری طور پر اپنی کوشش کا نتیجہ دیکھنا چاہتا ہے۔ انڈین ٹی وی ایکٹر ابھیشک بجاج (پیدائش 1991ء) نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ایکٹنگ میں کامیابی کے لیے کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے، اور نہ کوئی تعلق اور سمبندھ کام آتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ سخت محنت کرے، وہ تسلسل کے ساتھ اپنی صلاحیت کو بہتر بناتا رہے تب یقیناً اس کو کامیابی ملے گی:

"There is no shortcut to becoming an actor. You have to be honest and hardworking. You cannot just depend on the contacts you make in the industry; you need to keep working on your craft. You have to keep improving your skills and that’s when people will believe in your work," says Abhishek. (*Delhi Times*, 12 January 2022, p. 6)

یہ اصول صرف ایکٹنگ کی فیلڈ تک محدود نہیں، بلکہ زندگی کے دیگر تمام میدانوں میں کامیابی کے لیے بھی یہی اصول ہے۔ جب انسان کوئی کام کرتا ہے تو اس میں پچاس فیصد سے بھی کم حصہ اس کی اپنی کوشش کا ہوتا ہے، جب کہ پچاس فیصد سے زیادہ کردار قانونِ فطرت (Law of Nature) کا ہوتا ہے۔فطرت کا قانون خالق کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق اپنی رفتار سے چلتا ہے۔ایسی حالت میں اگر انسان کوشش کرتے ہوئے جلد بازی کا طریقہ اختیار نہ کرے تو گویا کہ وہ فطرت کو اُس کے حصے کا کام کرنے کا موقع دے رہا ہے۔ایسے ہی انسان کے لیے امید ہے کہ وہ کامیاب ہو۔(ڈاکٹر فریدہ خانم)

تقویٰ کی علامت

قرآن میں قربانی کے جانور کو شعیرہ کہا گیا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کو ان جانوروں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ اس کو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے (22:37)۔ اگر جانوروں کی قربانی سے سادہ طور پر صرف جانور کی قربانی مراد ہو تو یہاں یہ کہنا بے موقع ہے کہ خدا کو تمہارا ذبح کیا ہوا جانور نہیں پہنچتا بلکہ تمہارے دل کا تقویٰ پہنچتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام میں کچھ چیزیں بطور شعیرہ یا علامت (symbol) مقرر کی گئی ہیں۔ انھیں میں سے ایک قربانی کا جانور بھی ہے۔ شعیرہ اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی معنوی حقیقت کے لیے ظاہری علامت کا کام دے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ بندے اپنے شیطانی جذبات کو اللہ کی خاطر ذبح کریں۔ یہ ایک نفسیاتی ذبح ہے اور اس نفسیاتی ذبح کی علامت کے طور پر جانوروں کی قربانی کا حکم دیا گیا ہے۔ قربانی کرتے ہوئے آدمی اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کرتا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے، "میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لیے ہے" (6:162)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کی ایک معنوی حقیقت ہے، اور دوسری ظاہری علامت ہے۔ حقیقی قربانی اُسی شخص کی ہے، جس کی قربانی، خدا کے واسطے، اُس کے جذبات واحساسات کی قربانی کا ایک عملی محرک بن جائے۔

روزہ بھی اسی قسم کا ایک شعیرہ (علامت) ہے۔ ترکِ طعام حقیقتاً ترک معاصی کی علامت کے طور پر مقرر کیا گیا ہے۔ غذا آدمی کی ضروریات کی آخری حد ہے۔ روزہ میں غذا کا ترک بندے کی طرف سے اس بات کا اظہار ہے کہ خدایا، دوسری چیزیں تو درکنار، میں پانی اور کھانا تک کو تیری خاطر چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پانی چھوڑ دے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1903)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ کی اصل برائیوں سے بچنا ہے۔ جو شخص برائیوں کو نہ چھوڑے اور وقتی طور پر صرف کھانا اور پینا چھوڑ دے۔ اس نے گویا علامتی عمل پر اکتفا کیا اور اصلی عمل سے غافل رہا۔ ایسا بے روح عمل خدا کے یہاں اس قابل ہے کہ وہ ردّ کر دیا جائے۔

خدا کی بادشاہت

بائبل کے عہدنامہ جدید میں حضرت مسیح نے اپنے حواریوں کو ایک تعلیم دعا کے انداز میں اس طرح دی ہے — پس تم اس طرح دعا کیا کرو کہ اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہی آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے، زمین پر بھی ہو:

This is how you should pray: 'Our Father in heaven, hallowed be your name, your kingdom come, your will be done, on earth as it is in heaven.' (Matthew, 6:9-10)

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کی بادشاہی جس طرح آسمانوں میں قائم ہے، اسی طرح ہم کو یہ کرنا ہے کہ لڑ کر اس دنیا میں خدا کی بادشاہی کو بھی قائم کریں۔ اس میں دراصل خدا کی اس اسکیم کو بتایا گیا ہے، جس کے تحت اس نے دنیا کی تخلیق کی۔ یعنی خدا تمام عالم کا مطلق حاکم ہے، تمام عالم میں اس کا حکم کلی طور پر قائم ہے۔ لیکن انسانی دنیا میں اس نے وقتی طور پر انسان کو آزادی دے رکھی ہے۔ ایک وقت آئے گا، جب کہ یہ آزادی ختم ہوجائے گی، اور انسانی دنیا بھی اسی طرح براہ راست طور پر خدا کے حکم کے تحت آجائے گی، جس طرح بقیہ دنیا ہے۔

اس تخلیقی منصوبہ کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ اور زمین ساری اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں۔ وہ پاک اور برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں (39:67)۔

اس آیت کی تشریح ایک حدیثِ رسول میں اس طرح آئی ہے: يَقْبِضُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى الْأَرْضَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَيَطْوِي السَّمَاءَ بِيَمِينِهِ ثُمَّ يَقُولُ: أَنَا الْمَلِكُ أَيْنَ مُلُوكُ الْأَرْضِ؟ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2787)۔ یعنی، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن زمین کو مٹھی میں لے لے گا، اور آسمان کو اپنے داہنے ہاتھ میں لپیٹ کر رکھ لے گا، اور کہے گا کہ میں بادشاہ ہوں، زمین کے بادشاہ کہاں ہیں۔

منصوبۂ تخلیق کی روشنی میں انسان کے لیے حقیقت پسندانہ رویہ صرف ایک ہے، یعنی وہ اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے سامنے سرینڈر (surrender) کرے۔ وہ بظاہر با اختیار ہونے کے باوجود اللہ کی اس دنیا میں تواضع کے ساتھ زندگی گزارے۔

قربتِ خداوندی

قرآن کی سورۃ العلق میں ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (19:96)۔یعنی، سجدہ کر اور میرے قریب ہو جا۔

بندہ اور خدا کے درمیان قربت کی یہ بات ایک حدیثِ رسول میں ان الفاظ میں آئی ہے:
أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَهُوَ سَاجِدٌ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 482)۔یعنی، انسان اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے، جب کہ وہ سجدے میں ہو۔

بندہ اور خدا کے درمیان قربت کی یہ بات بائبل میں بھی آئی ہے۔عہد نامہ قدیم کے بارے میں زبور میں حضرت داؤد کی زبان سے آیا ہے — لیکن میرے لیے یہی بھلا ہے کہ میں خدا کی نزدیکی حاصل کروں، میں نے خداوند کو اپنی پناہ گاہ بنالیا ہے:

> But it is good for me to draw near to God: I have put my trust in the Lord God. (Psalm, 73:28)

سورۃ العلق کی آیت اور صحیح مسلم کی حدیث میں سجدہ کا لفظ علامتی معنی میں ہے، نہ کہ حقیقی معنی میں۔سجدہ کی اصل حقیقت کامل سپردگی (total submission) ہے۔یہ سپردگی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک داخلی کیفیت ہے۔معروف سجدہ اللہ کے لیے اسی داخلی سپردگی کی ایک خارجی علامت ہے۔وہی سجدہ سجدہ ہے، جس میں یہ حقیقت پائی جائے۔جو سجدہ اس حقیقت سے خالی ہو وہ صرف ایک بے روح رسم ہے، نہ کہ قربتِ خداوندی کا ایک زندہ تجربہ۔

جب ایک شخص نماز ادا کرتا ہے تو آخر میں وہ اپنی پیشانی زمین پر رکھ دیتا ہے، جس کو سجدہ کہا جاتا ہے۔مگر نمازی اس سجدے سے پہلے اور بہت سے افعال کرتا ہے۔یہ تمام افعال دراصل پری سجدہ (pre-sajdah) کی حیثیت رکھتے ہیں۔سجدے سے پہلے کیے جانے والے افعال گویا سجدہ کی تیاری ہیں، اور سجدہ اس تیاری کا نقطۂ انتہا۔

محبت کا نذرانہ

قرآن کی ایک آیت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: اور بعض انسان وہ ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے کرنا چاہیے۔ اور جو ایمان والے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں (2:165)۔

آدمی اپنی فطرت اور اپنے حالات کے لحاظ سے ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ خارجی سہارا چاہتا ہے، ایک ایسی ہستی جو اس کی کمیوں کی تلافی کرے، اور اس کے لیے اعتماد و یقین کی بنیاد ہو۔ کسی کو اس حیثیت سے اپنی زندگی میں شامل کرنا اس کو معبود بنانا ہے۔ جب آدمی کسی ہستی کو اپنا معبود بناتا ہے تو اس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی محبت اور عقیدت کے جذبات اس کے لیے خاص ہو جاتے ہیں۔ آدمی عین اپنی فطرت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ وہ کسی سے حبّ شدید کرے اور جس سے کوئی شخص حبّ شدید کرے وہی اس کا معبود ہے۔

موجودہ دنیا میں چوں کہ خدا نظر نہیں آتا اس لیے ظاہر پرست انسان عام طور پر نظر آنے والی ہستیوں میں سے کسی ہستی کو وہ مقام دے دیتا ہے جو در اصل خدا کو دینا چاہیے۔ یہ ہستیاں اکثر وہ سردار یا پیشوا ہوتے ہیں، جن کو آدمی "بڑا" سمجھ لیتا ہے اور پھر وہ دھیرے دھیرے لوگوں کی توجہات کا مرکز بن جاتے ہیں۔ لوگ اس طرح ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں جیسا گرویدہ انھیں صرف خدا کا ہونا چاہیے۔ آدمی کی فطرت کا خلا جو حقیقتاً اس لیے تھا کہ اس کو خدا سے پُر کیا جائے وہاں کسی غیر خدا کو بٹھا لیا جاتا ہے۔

انسان کے پاس کسی کو دینے کے لیے جو سب سے بڑی چیز ہے وہ محبت ہے۔ ایسی حالت میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص خدا جیسی با کمال ہستی کو پائے اور اس کی خدمت میں اعلی درجہ کی محبت سے کم تر کی کوئی چیز پیش کرے۔ محبت سے کم کوئی چیز نہ تو خدا قبول کرتا اور نہ کسی انسان کے لیے جائز ہے کہ وہ خدا کے حضور میں محبت سے کم کسی چیز کا نذرانہ پیش کرے۔ اپنی چیزوں میں سے کم تر کسی چیز کا ہدیہ خدا کو پیش کرنا صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی نے خدا کو اس کے جلال و کمال کے ساتھ پایا ہی نہیں۔

اللہ سے حُبِّ شدید

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حبِّ شدید کا حق دار صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن کی اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: کچھ لوگ ایسے ہیں، جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کے برابر (نِدّ) ٹھہراتے ہیں، وہ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جیسی اللہ سے رکھنا چاہیے۔ اور جو اہل ایمان ہیں، وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔ اور اگر یہ ظالم اس وقت کو دیکھ لیں جب کہ وہ عذاب سے دو چار ہوں گے تو وہ سمجھ لیتے ہیں کہ زور سارا کا سارا اللہ کا ہے اور اللہ بڑا عذاب دینے والا ہے۔ (2:165)

محبت کا مطلب گہرا قلبی تعلق (strong affection) ہے۔ محبت کا یہ گہرا تعلق صرف اللہ سے مطلوب ہے۔ مذکورہ آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سے حبّ شدید کا راز کیا ہے۔ اللہ کے ساتھ حبّ شدید بلاشبہ ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ یہ درجہ صرف اس انسان کو ملتا ہے۔ جو اس حقیقت کو شعوری طور پر دریافت کرے کہ قوت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کامل معنوں میں صاحبِ قوت (All-Powerful) ہے اور دوسرے تمام لوگ بشمول انبیاء اور اکابر کامل معنوں میں بے قوت (all-powerless) ہیں۔ یہی وہ دریافت ہے جس سے کسی آدمی کے اندر اللہ کے لیے وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے، جس کو حبّ شدید کہا گیا ہے۔

محبت کا تعلق ہمیشہ اسبابِ محبت سے ہوتا ہے۔ کسی انسان کے اندر اللہ کے لیے حبّ شدید صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ اس کے ذہن میں اس کے لیے گہرا سبب (strong reason) موجود ہو۔ اس حقیقت کا زندہ شعور کہ قوت ساری کی ساری صرف ایک اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہی وہ گہرا سبب ہے۔ جو کسی انسان کے اندر اللہ کے لیے حبّ شدید کا چشمہ جاری کرتا ہے۔ مزید یہ کہ نفسیاتی اعتبار سے قوت کوئی قابل تقسیم چیز نہیں۔ ادنیٰ درجے میں بھی اگر کسی اور کے لیے قوت کو مان لیا جائے تو اللہ کے لیے حبّ شدید کا خاتمہ ہوجائے گا، خواہ یہ دوسرا شخص سیاسی معنوں میں صاحبِ قوت ہو یا باعتبارِ دولت صاحب قوت ہو یا اخروی نجات کا اختیار رکھتا ہو۔

اس آیت میں نِدّ کا لفظ آیا ہے۔ اس کا لفظی مطلب ہے مثل، ہم پلہ اور شریک، وغیرہ۔ اس

آیت میں ندّ کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے کہ قوت کے اعتبار سے کسی کو ادنی —— درجے میں بھی اللہ کے برابر نہ سمجھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے میں بے حد حساس تھے۔ ایک بار ایک صحابی نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ (جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں)۔ یہ سنتے ہی آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آپ نے سختی کے لہجے میں کہا: جَعَلْتَنِي لِلّٰهِ عَدْلًا (کیا تم نے مجھ کو اللہ کے برابر کر دیا)۔ تم کو اس طرح کہنا چاہیے: مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ (وہی ہوگا جو صرف ایک اللہ چاہے) مسند احمد، حدیث نمبر 2561۔

اسی طرح ایک صحابی نے تقریر کرتے ہوئے کہا: مَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ رَشَدَ. وَمَنْ يَعْصِهِمَا فَقَدْ غَوَى (جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، وہ راہ راست پر ہے اور جو ان دونوں کی اطاعت نہ کرے وہ بھٹکا ہوا ہے)۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا: بِئْسَ الْخَطِيبُ أَنْتَ (تو قوم کا برا خطیب ہے) صحیح مسلم، حدیث نمبر 870۔ آپ نے پسند نہیں فرمایا کہ اللہ اور رسول دونوں کو ایک ضمیر (pronoun) میں جمع کر کے ہمسری پیدا کی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ندّ سے مراد صرف مخصوص نام نہیں ہے بلکہ اس میں ہر وہ عمل اور فکر شامل ہے جس سے ادنیٰ درجے میں بھی اللہ کی ہمسری کا شائبہ پیدا ہوتا ہو۔ حتیٰ کہ مذکورہ احادیث کے مطابق، اس معاملہ میں خود پیغمبر کا بھی کوئی استثنا نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر اعتبار سے اسوہ ہیں۔ مذکورہ روایات سے اس معاملے میں آپ کا اسوہ معلوم ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ایک مومن کو اتنا شدید ہونا چاہیے کہ وہ اللہ اور بندہ، حتیٰ کہ اللہ اور رسول کے درمیان ضمیر کی شرکت کو بھی گوارا نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات اتنی زیادہ ناپسند ہے کہ اسی پر آدمی کی جنت اور جہنم کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: مَنْ جَعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا، جَعَلَهُ اللّٰهُ فِي النَّارِ (مسند احمد، حدیث نمبر 3811)۔ یعنی جو شخص کسی کو اللہ کا ہمسر بنائے، اللہ اس کو آگ میں ڈال دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سے حبِّ شدید ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ لیکن اللہ سے حبّ شدید کی توفیق صرف اس انسان کو ملتی ہے، جو اس شعور میں جینے والا ہو کہ قوت اور اختیار تمام تر صرف ایک اللہ کے لیے ہے، اللہ کے سوا جو مخلوقات ہیں، ان کے پاس عجز کے سوا اور کچھ نہیں، خواہ وہ کوئی عام انسان ہو یا اللہ کا پیغمبر۔

رسول کو ماننا

احد کی جنگ میں جب ایک غلطی سے مسلمانوں کو شکست ہوئی تو لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی عزم وتوکل کے ساتھ اپنی جگہ قائم رہے۔ آپ کے ساتھ پندرہ افراد بھی تیروں اور تلواروں کی بارش میں جمے رہے۔ اس وقت ایک مشرک عبد اللہ بن قمیہ نے آپ پر پتھر سے حملہ کیا۔ یہ دیکھ کر آپ کے ساتھیوں میں سے حضرت مصعب بن عمیر اس کی طرف بڑھے۔ دونوں میں جنگ ہوئی۔ عبد اللہ بن قمیہ نے حضرت مصعب بن عمیر کو قتل کر دیا۔ اس نے سمجھا کہ یہ خود رسول اللہ تھے، اور اس نے آپ کو اپنی تلوار سے ہلاک کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ یہ کہنے لگا: قَتَلْتُ مُحَمَّدًا (میں نے محمد کو قتل کر دیا)۔ یہ خبر پھیلی تو مسلمانوں میں سے جو لوگ ادھر ادھر بکھر گئے تھے، وہ بھی اس سے متاثر ہوئے (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 78-73)۔

حضرت عبد اللہ بن عباس کی ایک طویل روایت ہے۔ اس میں یہ الفاظ آئے ہیں کچھ اہل نفاق نے کہا کہ اگر محمد قتل کر دیے گئے ہیں تو اب پہلے دین میں شامل ہو جاؤ۔ اس موقع پر سچے اہل ایمان نے ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ مثلاً حضرت انس بن نضر نے کہا: یا قَوْم إِنْ كَانَ مُحَمَّدٌ قَدْ قُتِلَ، فَإِنَّ رَبَّ مُحَمَّدٍ لَمْ يُقْتَلْ (تاریخ الطبری، جلد 2، صفحہ 520)۔ یعنی، اے لوگو، اگر محمد قتل کر دیے گئے ہیں تو محمد کا رب تو قتل نہیں ہوا۔

حضرت ثابت بن الدحداحہ نے کہا: إِنْ كَانَ مُحَمّدٌ قَدْ قُتِلَ فَإِنّ اللّٰهَ حَيّ لَا يَمُوتُ! فَقَاتِلُوا عَنْ دِينِكُمْ، فَإِنّ اللّٰهَ مُظْهِرُكُمْ وَنَاصِرُكُمْ (مغازی الواقدی، جلد 1، صفحہ 281)۔ یعنی، اگر محمد قتل کر دیے گئے تو اللہ، بیشک زندہ ہے، تم اپنے دین کے لیے قتال کرو، اللہ تم لوگوں کا ہے۔

ایک روایت کے مطابق ایک انصاری نے کہا: إِنْ كَانَ مُحَمَّدٌ قَدْ قُتِلَ فَقَدْ بَلّغَ، فَقَاتِلُوا عَنْ دِينِكُمْ (اگر محمد قتل کر دیے گئے ہیں تو وہ اپنا دین پہنچا چکے تو اب تم اس دین کے لیے لڑو)۔ اس پس منظر میں قرآن کی یہ آیت اتری:

وَما مُحَمَّدٌ إِلاّ رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ ماتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلى أَعْقابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللهَ شَيْئاً وَسَيَجْزِي اللهُ الشّاكِرِينَ (3:144)۔ یعنی، محمد تو صرف ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کردیے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو شخص الٹے پاؤں پھر جائے تو وہ ہرگز اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا، اور اللہ شکر گزاروں کو بدلہ عطا فرمائے گا۔

(دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد 2، صفحہ 249)۔

کچھ لوگ وہ ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حیثیت سے پہچانتے ہیں کہ انھوں نے دنیا کو فتح کیا۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو آپ کو اس حیثیت سے پہچانتے ہیں کہ آپ نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا۔ حقیقی مومن وہ ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد، مبشر اور نذیر کے روپ میں پہچانے۔ جو لوگ آپ کو فاتح کے روپ میں پہچانیں ان کی پہچان صرف مؤرخ کی پہچان ہے، نہ کہ مومن کی پہچان۔

فقدانِ معرفت کا دور

ایک لمبی روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے، جس میں بعد کے زمانے کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ اس کا ایک جزء یہ ہے: وَيُقَالُ لِلرَّجُلِ: مَا أَعْقَلَهُ وَمَا أَظْرَفَهُ وَمَا أَجْلَدَهُ، وَمَا فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةِ خَرْدَلٍ مِنْ إِيمَانٍ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6497؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 143)۔ یعنی کسی شخص کے متعلق کہا جائے گا کہ کتنا عقلمند ہے، کتنا بلند حوصلہ ہے اور کتنا بہادر ہے۔ حالانکہ اس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان نہیں ہوگا۔

اطاعتِ رسول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا ایک سبق آموز واقعہ اسلامی تاریخ کی کتابوں میں ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت ابوقتادہ بیان کرتے ہیں:

بعث رسول اللہ جَيْشَ الأُمَرَاءِ، فَقَالَ: عَلَيْكُمْ زَيْدُ بْنُ حَارِثَةَ، فان اصيب فجعفر ابن أَبِي طَالِبٍ، فَإِنْ أُصِيبَ جَعْفَرٌ فَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ رَوَاحَةَ، فَوَثَبَ جَعْفَرٌ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَا كُنْتُ أَذْهَبُ أَنْ تَسْتَعْمِلَ زَيْدًا عَلَيَّ! قَالَ: امْضِ، فَإِنَّكَ لا تَدْرِي أَيُّ ذَلِكَ خَيْرٌ! فَانْطَلَقُوا (تاریخ الطبری، جلد 3، صفحہ 40)۔ یعنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موتہ کے لیے لشکر بھیجا۔ ان کو آپ نے ہدایت دیتے ہوئے کہا کہ زید بن حارثہ تمہارے سردار ہیں، وہ شہید ہوجائیں تو جعفر بن ابی طالب سردار ہوں گے۔ اور اگر جعفر شہید ہوجائیں تو عبد اللہ بن رواحہ سردار ہوں گے۔ یہ سن کر جعفر جھپٹ کر اٹھے اور کہا کہ اے خدا کے رسول، میں ایسے لشکر میں نہیں جاؤں گا جس میں آپ نے زید کو میرے اوپر سردار بنایا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ، کیوں کہ تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون سا امر تمہارے لیے بہتر ہے۔ پھر وہ لوگ روانہ ہوگئے۔

مومن فرشتہ نہیں ہوتا۔ مومن بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتا ہے۔ اس کے باوجود مومن اور غیر مومن انسان میں بہت بڑا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ غیر مومن کے دل میں کوئی غلط خیال یا انحراف کی بات آجائے تو اس کے بعد وہ رکنا نہیں جانتا۔ وہ اپنے اسی خیال پر چل پڑتا ہے، خواہ اس کی غلطی اس پر کتنی ہی زیادہ واضح کی جائے۔ وہ دلیل کی پیروی نہیں کرتا، بلکہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔

اس کے برعکس، سچے مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اس کو اس کی غلطی پر ٹوکا جائے اور اس کے انحراف پر اسے متنبہ کیا جائے تو وہ فوراً رک جاتا ہے۔ وہ اپنے خیال کو اپنا عمل نہیں بناتا۔ وہ اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتا۔ وہ ہر وقت اپنی اصلاح کے لیے تیار رہتا ہے، خواہ اصلاح کی خاطر اس کو اپنی خواہش کے خلاف چلنا پڑے — مومن حق کا پابند ہوتا ہے اور غیر مومن صرف اپنے نفس کا پابند۔

قومی بے عزتی یا محبت رسول

مولانا محمود حسن دیوبندی (وفات 1920) دار العلوم دیوبند میں شیخ الحدیث تھے۔ ایک بار جب وہ صحیح بخاری کا درس دے رہے تھے۔ ایک حدیث کی تشریح کے دوران انھوں نے اس بات کا ذکر کیا کہ مسلمان رسول کی بے حرمتی کے نام پر سخت مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اس کا سبب بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ رسول کی بے حرمتی یا سُبکی جو مسلمانوں کے لیے ناقابلِ برداشت بن جاتی ہے، اس کی وجہ رسول کی محبت تو نہیں ہوسکتی۔ درحقیقت رسول کی سُبکی میں اپنی سُبکی کا غیر شعوری احساس پوشیدہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی خودی اور انانیت مجروح ہوتی ہے، ہم جس کو اپنا پیغمبر اور رسول مانتے ہیں۔ تم اس کی اہانت نہیں کر سکتے۔ چوٹ درحقیقت اپنی اسی "ہم" پر پڑتی ہے، لیکن مغالطہ یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نے انتقام پر آمادہ کیا ہے، نفس کا یہ دھوکہ ہے۔ (احاطہ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن از مولانا مناظر احسن گیلانی، صفحہ 155-153)

اصل یہ ہے کہ مسلمانوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر رسول کو اپنا قومی فخر بنا رکھا ہے۔ اس لیے جب کوئی شخص کوئی ایسی بات کہے جو مسلمانوں کے نزدیک رسول کی اہانت کے ہم معنی ہو تو وہ اس کو اپنی قومی بے عزتی سمجھ لیتے ہیں۔ ایسے کسی واقعے پر مسلمانوں کے قومی فخر کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں، اور وہ ہنگامے کرنے لگتے ہیں۔ مگر اس قسم کے ردّ عمل کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔ اسلام سے اس کا تعلق اس لیے نہیں ہے کہ اسلام میں دعوت کی تعلیم دی گئی ہے، یعنی کوئی شخص منفی بات بولے تب بھی اس کو ایسا انسان سمجھنا چاہیے جو سچائی سے بے خبر ہو۔ چنانچہ یہ ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ایسے انسان کو دشمن سمجھنے کے بجائے اس کے سامنے دینِ حق کا پیغام پر امن انداز میں رکھا جائے۔ اور اس قسم کا ردّ عمل عقل پر مبنی اس لیے نہیں ہے کہ کسی شخص کے منفی کلام کا تعلق آدمی کی فطری آزادی سے ہے، جو کہ خدائی منصوبۂ تخلیق کے تحت اس کو اللہ کی طرف سے ملی ہوئی ہے۔ چونکہ مسلمان اس منصوبۂ تخلیق کو منسوخ نہیں کر سکتے۔ اس لیے اہانت جیسے واقعات کا خاتمہ بھی ان کے لیے ممکن نہیں۔ اِس طرح کے معاملے میں مسلمانوں کے لیے کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ وہ غصہ اور نفرت میں مبتلا نہ ہوں، بلکہ وہ ایسے لوگوں کے حق میں ہدایت کی دعا کریں اور پُر امن اندازی میں حکمت اور خیر خواہی کے ساتھ ان کو اللہ کا پیغام پہنچائیں۔

متعصّبانہ طرزِ فکر

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے۔ حضرت ابودرداء روایت کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَيُصِمُّ (مسند احمد، حدیث نمبر 21694)۔ یعنی کسی چیز کی محبت تم کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔

اس حدیث میں حُبّ سے مراد سادہ طور پر صرف محبت نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد غلوآمیز محبت ہے۔ اس حدیث میں حُبّ کے جس غیر مطلوب نتیجے کا ذکر ہے، اس کا تعلق غلوآمیز محبت سے ہے، نہ کہ صرف محبت سے۔ غلوآمیز محبت آدمی کے اندر جو غیر مطلوب صفت پیدا کرتی ہے، وہ وہی چیز ہے جس کو متعصّبانہ فکر (biased thinking) کہا جاتا ہے۔ یہی متعصّبانہ فکر ہے، جو آدمی کو کسی چیز کے بارے میں اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ مثلاً موجودہ زمانے میں قوم پرستی اس کا ایک ظاہرہ ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب اپنی کمیونٹی اور دوسری کمیونٹی کا کوئی معاملہ پیش آجائے تو وہ اپنی کمیونٹی کی غلطی سمجھ نہیں پاتے۔ ان کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ میں ہر حال میں اپنی کمیونٹی کے ساتھ ہوں، خواہ وہ صحیح ہو یا غلط (my community, right or wrong)۔

اس متعصّبانہ طرزِ فکر کے بیک وقت دو نقصان ہیں۔ ایک یہ کہ خود آدمی کے اندر ابدی طور پر منفی سوچ (negative thinking) پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ اس صلاحیت سے محروم ہوجاتا ہے کہ وہ چیزوں کو غیر جانبدارانہ انداز (impartial way) میں دیکھ سکے۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ وہ خود اپنی کمیونٹی کے لیے ایک برا قائد بن جاتا ہے۔ اختلافی معاملات میں وہ اپنی کمیونٹی کو صحیح رہنمائی نہیں دے پاتا۔

متعصّبانہ طرزِ فکر ہر حال میں ایک تباہ کن طرزِ فکر ہے۔ ایسا آدمی اس سے محروم ہوجاتا ہے کہ وہ دنیا میں اس صالح فکری غذا کو لے سکے جو اس کے خالق نے اس کے لیے مہیا کر رکھا ہے، اور جس کو قرآن میں رزقِ رب کہا گیا ہے۔ رزقِ رب کا حصول اس دنیا میں ربّانی شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری ہے، لیکن اپنے اندر ربّانی شخصیت کی تعمیر کی سعادت صرف اس شخص کو ملتی ہے، جس کے اندر مثبت سوچ پائی جائے۔

انسان کا مقصدِ تخلیق

انسان کی تخلیق اورزمین پراس کی آبادکاری ایک انتہائی معجزاتی واقعہ ہے۔انسان ماں کے پیٹ میں اپنی زندگی کی ابتدا کرتا ہے۔ماں کا پیٹ ایک انتہائی مکمل قسم کا کارخانہ ہے،جس میں انسان بتدریج ایک بچے کی صورت میں وجود پاتا ہے۔پھرایک مقرر مدت کے بعد وہ ماں کے پیٹ سے نکل کرزمین پر آباد ہوتا ہے۔یہاں انسان کے لیے پہلے سے ایک موافق دنیا،دوسرے الفاظ میں کسٹم میڈ یونیورس (custom made universe) موجود ہوتی ہے۔اس دنیا میں اعلیٰ انتظام کے تحت انسان کا ڈیولپمنٹ ہوتا ہے۔یہاں تک کہ ایک مقرر مدت کے بعد انسان پر موت کا تجربہ پیش آتا ہے،جس کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے،ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے(3:185)۔

انسان کی اس تخلیق کا مقصد کیا ہے۔تخلیقی پلان کے مطابق، خالق کو انسان سے کیا مطلوب ہے۔اس کا جواب قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔قرآن میں متعلق آیات کے الفاظ یہ ہیں: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۔ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمُونِ ۔ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ (51:56-58)۔یعنی اور میں نے جن اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔میں ان سے رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلائیں۔بیشک اللہ ہی روزی دینے والا،زورآور،زبردست ہے۔

ان آیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق یک طرفہ پلاننگ کے تحت ہوئی ہے۔یہاں خدا خالق ہے،اور انسان کا درجہ مخلوق کا۔تخلیق کا یہ معاملہ خدا کی یک طرفہ رزاقیت کا معاملہ ہے۔انسان کے مقصدِ تخلیق کو سمجھنے کے لیے سب سے زیادہ غور طلب لفظ لِيَعْبُدُونِ ہے،جس کی تفسیر لِيَعْرِفُونِ سے کی گئی ہے(تفسیر مقاتل بن سلیمان، جلد4،صفحہ 133)۔یہ تفسیر اصلاً عبد اللہ ابن عباس صحابی کی ہے(المجالسہ وجواہر العلم للدینوری، اثر نمبر 225)،اس کے بعد ان کے شاگرد مجاہد بن جبر تابعی نے اس کو نقل کیا ہے(تفسیر البغوی، جلد 4،صفحہ 288)۔اس اعتبار سے آیت کی یہ تفسیر ایک معتبر تفسیر کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس تفسیر کے مطابق غور کیا جائے، تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان کی تخلیق کا مقصد اصلاً یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی معرفت حاصل کرے۔ کائنات میں سب کچھ تھا، لیکن خود شعوری کا ظاہرہ (phenomena) موجود نہ تھا۔ خالق نے چاہا کہ یہاں ایک ایسی مخلوق پیدا ہو، جو شعور کی صلاحیت رکھنے والی ہو۔ انسان کی ساخت اس تفسیر کی تائید کرتی ہے۔ کیوں کہ انسان کو جن صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے، وہ اس تفسیر کے ساتھ پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔

انسان کی شخصیت کا مطالعہ کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا ماڈل اسی مقصد کے مطابق بنایا گیا ہے۔ انسان گویا اس بات کی پوری صلاحیت رکھتا (well equipped) ہے کہ وہ اپنے خالق کو دریافت کرے۔ خالق کی دریافت کے سوا انسان کا کوئی اور مقصد وجود نہیں۔

قرآن کی اس آیت پر مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اللہ رب العالمین کو یہ مطلوب تھا کہ کائنات میں ایک ایسی مخلوق ہو، جو سیلف ڈسکوری (self discovery) کی سطح پر اپنے خالق کو دریافت کرے، اور پھر اس خود دریافت کردہ معرفت کی سطح پر وہ کھڑا ہو۔ یعنی ایک ایسی مخلوق جو اپنی ذاتی دریافت کی بنیاد پر یہ اعلان کرے کہ خدایا— تو خالق ہے، میں مخلوق ہوں، تو دینے والا (giver) ہے، اور میں پانے والا (taker) ہوں، تو واجد (Originator) ہے، اور میں موجود (created being) ہوں۔

خالق کو یہ مطلوب تھا کہ ایک ایسی مخلوق ہو، جو اس حقیقت اعلیٰ کو شعوری دریافت کے ذریعہ جانے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ ایک ایسی مخلوق جو قادرِ مطلق خدا کے مقابلے میں شعوری طور پر اپنے عجزِ مطلق کی دوسری انتہا (extent) بنائے۔ یہی انسان کی تخلیق کا اصل مقصد ہے۔ یہ انسان کی ترقی کا آخری درجہ ہے۔ جو لوگ شعوری ارتقا کے اس درجے تک پہنچیں، اور اس دریافت کے مطابق، دنیا میں زندگی گزاریں، وہی وہ لوگ ہیں، جو جنت میں آباد کاری کے لیے چنے جائیں گے۔ جہاں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ اسی عارف مخلوق کا نام انسان ہے، اور دریافت خویش کے اس درجے تک پہنچنے کا نام معرفت ہے۔

شیطان کا مقابلہ

قرآن میں آدم اور ابلیس کا قصہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے۔اس کے مطابق ، یہ ہوا کہ شیطان آغاز ہی میں انسان کا دشمن بن گیا۔اس نے اعلان کیا کہ میں انسان کو بہکاؤں گا اور اس کو جنت کے راستے سے دور کردوں گا۔اللہ تعالیٰ نے شیطان کو آزادی دے دی،لیکن اسی کے ساتھ یہ فرمایا : إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (15:42)۔یعنی، جو میرے بندے ہیں، ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔قرآن کی اس آیت میں سلطان کا مطلب کیا ہے۔اس سلسلے میں مفسرین کی رائے کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:إِنَّ عِبَادِي الْمُؤْمِنِينَ لَا قُوَّةَ عَلَيْهِمْ فِي إِضْلَالِهِمْ (صفوۃ التفاسیر للصابونی، جلد2،صفحہ101)۔یعنی،تم کو یہ قدرت حاصل نہیں ہوگی کہ تم میرے مومن بندوں کو گمراہ کرسکو۔

یہاں یہ سوال ہے کہ مومن بندے کس طرح شیطان کے وسوسہ اور تزئین سے محفوظ رہیں گے۔یہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں۔اس کا تعلق دراصل اہل ایمان کی ذہنی بیداری سے ہے۔اسی ذہنی بیداری (intellectual awakening) کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ شیطان کے وسوسہ اور تزئین کو فوراً پہچان لیتا ہے اور اس کو ڈی فیوز کر کے اس کو بے اثر بنا دیتا ہے۔قرآن میں ہے کہ جو لوگ تقویٰ والے ہیں جب کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انھیں چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے(7:201)۔

ڈی فیوز (defuse) کا لفظ اس معاملے کو اچھی طرح واضح کرتا ہے۔موجودہ زمانے میں جو بم بنائے جاتے ہیں۔ان کے اندر دھماکہ خیز مادے کے علاوہ ایک باریک تار لگا ہوتا ہے۔جس کو فیوز (fuse) کہتے ہیں۔اس فیوز میں آگ لگنے سے بم میں دھماکہ ہوتا ہے۔پولس جب کسی بم کو ناکارہ بنانا چاہتی ہے تو وہ یہ کرتی ہے کہ مخصوص ٹکنیک کے ذریعے اس کے فیوز کو نکال دیتی ہے۔اس کے بعد بم ناکارہ ہو جاتا ہے اور پھٹنے کے قابل نہیں رہتا۔اس عمل کو ڈی فیوز کرنا کہا جاتا ہے۔اس عمل کو مومن فکری اعتبار سے کرتا ہے۔وہ فکری سطح پر شیطان کے بم کو ڈی فیوز کر دیتا ہے۔اس طرح وہ شیطان کے وسوسہ اور تزئین سے محفوظ رہتا ہے۔

تزئین کیا ہے

ابلیس، انسان کا دشمن ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ابلیس (شیطان) نے آغازِ انسانیت میں یہ چیلنج دیا تھا کہ وہ انسانی نسل کی اکثریت کو گمراہی میں ڈال دے گا۔ اس نے کہا تھا:

قَالَ أَرَأَيْتَكَ هٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا (17:62) یعنی، اس نے کہا، ذرا دیکھ، یہ شخص جس کو تو نے مجھ پر عزت دی ہے اگر تو مجھ کو قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں تھوڑے لوگوں کے سوا اس کی تمام اولاد کو کھا جاؤں گا۔

ابلیس کو یہ اختیار نہیں کہ وہ انسان کے خلاف کوئی جارحانہ (aggressive) کارروائی کرے۔ ابلیس کے بس میں صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے انسان کے ذہن میں وسوسہ ڈالنا، انسان کو فکری اعتبار سے بہکانا۔ اس معاملے میں شیطان کا طریقہ کیا ہے۔ قرآن کے مطابق، وہ وسوسہ (الاعراف، 7:20) اور تزئین (الحجر، 15:39) کا طریقہ ہے۔ یعنی انسان کے خلاف ابلیس کی کارروائیاں ہمیشہ ذہنی سطح (intellectual level) پر ہوتی ہیں، نہ کہ جسمانی سطح (physical level) پر۔ اس لیے ابلیس کے فتنوں سے بچنے کے لیے انسان کو ذہنی تحفظ کی ضرورت ہے، نہ کہ جسمانی تحفظ کی۔

ابلیس کا وسوسہ اور تزئین کوئی یک طرفہ معاملہ نہیں، بلکہ وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، دوطرفہ (bilateral) معاملہ ہے۔ ابلیس اپنے وسوسہ اور تزئین میں اس لیے کامیاب ہوتا ہے کہ وہ انسان کے اندر ایک کمزوری تلاش کرتا ہے۔ اس کمزوری کو تلاش کر کے وہ انسان کو بذریعہ وسوسہ اور تزئین گمراہی میں ڈال دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قانون داں (وکیل) قانون میں لوپ ہول تلاش کر کے اس کو استعمال کرتا ہے:

Lawyers always exploit the legal loopholes.

یہی طریقہ ابلیس کا ہے۔ ابلیس چاہتا ہے کہ وہ انسان کی سوچ اور جذبات میں ایک لوپ ہول

تلاش کرے اور پھر اس لوپ ہول کو استعمال کرکے وہ انسان کو صحیح راستے سے بھٹکا دے۔

Satan always exploits the loopholes of human sentiments.

مثال کے طور پر ابلیس نے آدم کو بہکانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا تھا، اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَا يَبْلَى (20:120)۔یعنی، پھر شیطان نے ان کو بہکایا۔ اس نے کہا کہ اے آدم، کیا میں تم کو ہمیشگی کا درخت بتاؤں۔ اور ایسی بادشاہی جس میں کبھی کمزوری نہ آئے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس نے آدم کے اندر موجود خواہشِ ابدیت کو استعمال کرکے ان کو بہکایا تھا۔ یہاں ظاہر ہے کہ وسوسہ ایک غیر محسوس چیز ہے۔ وسوسہ کو چھوکر یا دیکھ کر نہیں جانا جاسکتا، وسوسہ کے شر سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے عقل کو استعمال کرکے وسوسہ کو دریافت کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن کو بیدار رکھے۔ اس کے بعد وہ اس قابل ہوجائے گا کہ وہ شیطان کے وسوسہ کا تجزیہ کرے اور اس طرح وہ اس سے متاثر نہ ہو۔ ایسے آدمی کی ذہنی بیداری اُس کو ایسے مواقع پر ابلیس سے محفوظ رکھنے کی ضامن بن جائے گی۔

فطرت کا عمل

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اس نے اپنی فیملی کے لیے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ کچھ نہ کرنا سب سے بڑا کرنا ہے۔ اس لیے کہ جب آپ کچھ نہیں کرتے ہیں تو فطرت کا نظام متحرک ہوجاتا ہے۔ اور فطرت کا نظام اس سے زیادہ کردیتا ہے جتنا آپ کرتے۔ زندگی میں سب سے بڑا عامل (incentive) آپ خود نہیں، سب سے بڑا عامل فطرت ہے۔

بڑھاپے کا سبق

قرآن کی مختلف آیتوں میں بڑھاپے کی عمر کا ذکر آیا ہے۔ ان میں سے ایک آیت یہ ہے: أَوَلَمۡ نُعَمِّرۡكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ ٱلنَّذِيرُ (35:37)۔ یعنی کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی کہ جس کو سمجھنا ہو، وہ سمجھ لے۔ اور تمہارے پاس ہوشیار کرنے والا آیا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپے کی عمر گویا ایک قسم کا فطری جبر (compulsion) ہے۔ انسان پیدا ہونے کے بعد پہلے طاقت کا تجربہ کرتا ہے۔ اس کے بعد اس پر بڑھاپے کا دور آتا ہے۔ اب وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ذاتی تجربے کے ذریعے یہ دریافت کرے کہ انسان کے اوپر ایک اور طاقت ہے، جو پہلے جوانی کی عمر عطا کرتا ہے، اس کے بعد اس کو بڑھاپے کی عمر میں مبتلا کر دیتا ہے۔

یہ فطری اشارہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت کو جانے، اور مین کٹ ٹو سائز (man cut to size) بن کر زندگی گزارے۔ وہ اس بات کو ریلائز (realize) کرے کہ وہ اس دنیا کا خالق نہیں ہے۔ بلکہ ایک پیدا کرنے والے نے اس کو ایک منصوبے کے تحت پیدا کیا ہے۔ وہ منصوبہ یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقتِ واقعی کو دریافت کرے۔

ایک انسان جب اپنی حقیقت واقعی کو دریافت کرلیتا ہے تو وہ متواضع انسان بن جاتا ہے۔ متواضع انسان کو ایک حدیث رسول میں عبدِ شکور کہا گیا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

سمعتُ المُغِيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، يَقُولُ: إِنْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَقُومُ لِيُصَلِّيَ حَتَّى تَرِمُ قَدَمَاهُ - أَوْ سَاقَاهُ - فَيُقَالُ لَهُ فَيَقُولُ: أَفَلاَ أَكُونُ عَبْدًا شَكُورًا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1130)۔ یعنی، حضرت مغیرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہوتے، یہاں تک کہ آپ کے دونوں قدموں یا پنڈلیوں میں ورم آجاتا۔ آپ سے کہا گیا (کہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟) تو آپ نے جواب دیا: کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

کنفیوزن کیوں

آپ لوگوں سے بات کریں، تو آپ پائیں گے کہ کوئی آدمی وضوح (clarity) کے ساتھ بات نہیں کر رہا ہے۔ ہر ایک کی بات میں کنفیوزن ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر آدمی مختلف قسموں کے انسانوں کے درمیان جیتا ہے۔ ہر آدمی مختلف افکار کے جنگل میں سانس لیتا ہے۔ یہ واقعہ ہر آدمی کو کنڈیشننگ کا کیس بنا دیتا ہے۔ اس معاملے میں آدمی کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنا فکری تجزیہ کرکے اپنے آپ کو ڈی کنڈیشنڈ انسان بنائے۔ آدمی جب تک یہ کام نہیں کرے گا، وہ عملاً فکری وضوح میں جینے والا نہیں بن سکتا۔

یہ ہماری اجتماعی زندگی کا ایک لازمی مسئلہ ہے۔ ہر آدمی کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ چیزوں کو سارٹ آؤٹ (sort out) کرے، وہ چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کرے۔ وہ سفید کو سیاہ سے الگ کرے، اور سیاہ کو سفید سے الگ کرکے پہچانے۔ ایسے ہی انسان کا نام ڈی کنڈیشنڈ انسان ہے۔ ایسا ہی انسان وہ ہے، جو اس حدیث کا مصداق بنے گا، جس میں دعا کی زبان میں کہا گیا ہے: اللَّهُمَّ أَرِنَا الْأَشْيَاءَ كَمَا هِيَ (تفسیر الرازی، جلد 13، صفحہ 37)۔ یعنی اے اللہ، مجھ کو یہ توفیق دے کہ میں چیزوں کو ایز اٹ از (as it is) دیکھ سکوں۔ چیزوں کے بارے میں بے آمیز رائے قائم کروں۔

مثلاً آج کل کے سیاسی حالات پر زیادہ تر لوگ منفی سوچ کے حامل بنے ہوئے ہیں۔ مگر میں، اللہ کے فضل سے، اس فکری برائی سے پاک ہوں۔ میں نے معاملے کو گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کی تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ گزشتہ کئی برسوں سے مسلمانوں نے یہ مہم چلائی تھی کہ ایک خاص سیاسی پارٹی کو شکست دی جائے۔ اس کے نتیجے میں اُس پارٹی کے اندر ایک جوابی ذہن پیدا ہوا۔ جب وہ پارٹی اقتدار میں آئی، تو اس نے اپنے دفاع میں یہ طرزِ عمل اختیار کیا کہ مسلمانوں کو دوبارہ ایسی مخالفانہ تحریک چلانے کا موقع نہ دیا جائے۔

لہٰذا، موجودہ حالات میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ دراصل ایک جوابی کارروائی ہے۔ یہ کوئی اینٹی مسلم تحریک نہیں، بلکہ ایک دفاعی ردِّعمل ہے — جو خود مسلمانوں کی ناعاقبت اندیش سیاسی پالیسی (shortsighted policy) کا فطری نتیجہ ہے۔

دفع کا قانون

قرآن کی دو آیتوں (البقرۃ، 2:251؛ الحج، 22:40) میں دفع کا قانون بتایا گیا ہے۔ دفع کا لفظی مطلب ہے، ہٹانا (to repel)۔ خالق نے اس دنیا کو آزادی کے اصول پر بنایا ہے، اس بنا پر دنیا میں قوموں کے درمیان ہمیشہ مقابلے کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس دوران ایک گروہ دوسرے گروہ کے اوپر غالب آجاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو اور ایک گروہ کو مسلسل طور پر غلبہ کا موقع ملتا رہے، تو دنیا میں فساد پیدا ہوجائے۔ اس لیے خدا اس معاملے کو اس طرح مینج کرتا ہے کہ ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان مقابلہ پیش آتا ہے۔ یہاں تک کہ جو گروہ مفسد گروہ ہوتا ہے، اس کو دوسرا گروہ ہٹا دیتا ہے، جو نسبتاً غیر مفسد گروہ ہوتا ہے۔ یہ عمل اگرچہ ارتقا کا عمل نہیں ہے، مگر وہ بقائے اصلح (survival of the fittest) کے مشابہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کی پیدائش فطرت کے جس نظام کے تحت ہوئی ہے، اس کے مطابق، انسان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلسل طور پر متحرک رہے۔ حرکت سے انسان کے اندر ترقی ہوتی ہے، اور ٹھہراؤ سے انسان کے اندر جمود (stagnation) آجاتا ہے۔ جب کوئی انسانی گروہ ترقی کی انتہا کو پہنچ جائے تو اس کے اندر جمود آنا شروع ہوجاتا ہے۔ اس بنا پر خالق نے یہ مقدر کردیا کہ انسان کو ہمیشہ شاک لگتا رہے۔ اس بنا پر انسان کے لیے شاک ٹریٹمنٹ (shock treatment) کا طریقہ مقرر کیا گیا۔ دفع کا قانون گویا انسانی سماج کے لیے ایک شاک ٹریٹمنٹ ہے۔

یہ عمل اس طرح پیش آتا ہے کہ کچھ مصلحین یا منذرین اٹھتے ہیں، وہ لوگوں کو ان کی غلطیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ صالح گروہ کو بقا مل جاتی ہے، اور دوسرا گروہ جو غیر صالح ہوتا ہے، اس کو قیادت وغلبہ کے میدان سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ یہ عمل پوری انسانی تاریخ میں جاری رہا ہے۔

اس عمل کا پہلا مظاہرہ حضرت نوح کے زمانے میں ہوا۔ حضرت نوح نے اپنے زمانے کے لوگوں پر انذار کا عمل کیا۔ کچھ لوگوں نے پیغمبر نوح کی اصلاح کو قبول کیا، اور زیادہ تر لوگ بگاڑ پر قائم رہے۔ اس

کے بعد ایک بڑا طوفان (Great Flood) آیا۔ اس طوفان میں مفسد لوگ ختم ہوگئے، اور جو لوگ نسبتاً صالح تھے، ان کو حضرت نوح نے کشتی پر سوار کیا۔ یہ کشتی عراق کے علاقے سے بہتی ہوئی ترکی کی سرحد پر ارارات کے علاقے میں پہنچی۔ یہ جگہ تین براعظموں کا سنگم تھی، ایشیا، افریقہ اور یوروپ۔

حضرت نوح کی کشتی یہاں رکی، اس کے بعد جو لوگ طوفان سے بچ گئے تھے، وہ کشتی سے نکل کر دھیرے دھیرے منتشر (disperse) ہوگئے۔ آخر کار یہ لوگ تین براعظموں، ایشیا، افریقہ، اور یورپ میں بس گئے۔ ان لوگوں کے ذریعے ایک نئی نسل بنی، جو ان براعظموں میں پھیلی تھی۔ ان لوگوں نے انسانیت کی نئی تاریخ بنائی۔ یہ لوگ پیغمبر نوح کے تین بیٹوں، حام، سام اور یافث کی نسل سے تھے۔

لیکن بعد کے زمانے میں ان لوگوں میں دوبارہ بگاڑ آیا۔ یہی وہ زمانہ ہے، جس کے بارے میں حضرت ابراہیم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا: رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيراً مِنَ النَّاسِ (14:36)۔ یعنی، اے میرے رب، انھوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کردیا۔

اس آیت کو سمجھنے کے لیے صحرائی زندگی کو سامنے رکھنا چاہیے۔ صحرائی زندگی میں سورج، چاند اور ستارے، بہت زیادہ روشن نظر آتے ہیں۔ اس سے انسان کے اندر روشن اجرام سماوی کے بارے میں تحیر کا مزاج (sense of awe) پیدا ہوا، اور انسانوں کے اندر وہ چیز پیدا ہوئی، جس کو تاریخ میں فطرت پرستی (nature worship) کہا جاتا ہے۔ اس دور سے فائدہ اٹھا کر وہ ظاہرہ پیدا ہوا، جس کو شرک کہا جاتا ہے۔ یہیں سے بادشاہت وجود میں آئی۔ بادشاہوں نے فوج بنا کر بزور اپنی حکمرانی قائم کرلی۔ بادشاہ لوگ اجرامِ سماوی کے حوالے سے اپنی مطلق حکمرانی (absolute sovereignty) کے دعویدار بن گئے۔

اپنی اس مطلق حکمرانی کے جواز کے لیے یہ نظریہ ایجاد کیا کہ جو بادشاہ کا دین ہے، وہی سب کا دین ہے۔ بادشاہ کا دین ہی حکومت سے وفاداری کا نشان بن گیا۔ یہ تصور بڑھتے بڑھتے مذہبی جبر (religious persecution) کی شکل میں ہر جگہ قائم ہوگیا۔ شرک کو ختم کرنے کے لیے پہلے اگر تبلیغ کا عمل کافی ہوسکتا تھا، تو اب اس کو ختم کرنے کے لیے اس سے لڑنا ضروری ہوگیا۔

تاریخ کا یہی وہ موڑ ہے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کے حکم سے ایک نئی پلاننگ شروع کی۔ انھوں نے عرب کے صحرا میں ایک بے حد مشکل عمل شروع کیا، جس کو ڈیزرٹ تھرَپی (Desert Therapy) کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنے بیٹے اسماعیل کو بے آب و گیاہ صحرا میں لاکر آباد کردیا۔ جو گویا کہ ان کو قربان کردینے کے ہم معنی تھا۔ اس قربانی کو قرآن میں ذِبحِ عظیم (الصافات، 37:107) کہا گیا ہے۔ اس طرح صحرا میں ایک نئی نسل بننا شروع ہوئی، جو نیچر پرستی کی برائی سے پاک تھی۔

یہ وہی نسل تھی، جس میں چھٹی صدی عیسوی میں رسول اور اصحاب رسول پیدا ہوئے۔ پھر ایسا ہوا کہ اپنے زمانے کی دو عظیم سپر پاوروں کے ساتھ ان کے ٹکراؤ کا واقعہ پیش آیا، جس میں وہ دونوں عظیم سلطنتیں ختم ہوگئیں۔ مگر ان کا خاتمہ قانونِ دفع کے تحت انجام پایا۔ کیوں کہ یہ دونوں سپر پاور اپنے زمانے میں مذہبی جبر (religious persecution) کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کے خاتمے کے بعد خدا نے رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے انسانی تاریخ میں وہ انقلابی پراسس جاری کیا، جس کا کلمینیشن (culmination) موجودہ زمانے کا جمہوری اور سائنسی انقلاب ہے۔

دفع کی ایک صورت وہ ہے، جب کہ دو فریقوں میں سے ایک کے ذریعہ دوسرے غالب فریق کو دنیا کی قیادت سے ہٹا دیا جائے۔ دفع کی دوسری صورت یہ ہے کہ خود ایک ہی فریق کو بذریعہ اصلاح اس کی بے راہ روی سے ہٹا کر صحیح راستے پر لایا جائے۔

اس معاملے میں اصل اہمیت یہ ہے کہ جب کوئی نئی صورتِ حال پیش آئے تو انسان غیر جانب دارانہ تجزیہ کے ذریعے اس کی حقیقت کو دریافت کرے۔ اس طرح اس قسم کے منفی واقعات اس کے لیے مثبت نتیجہ کا سبب بنیں گے۔ وہ بار بار اپنے عمل کی ری پلاننگ کرے گا۔ اس کو اپنی غلطیوں سے اپنے لیے نیا ڈائریکشن (new direction) ملے گا۔ اس طرح ہر غیر مطلوب تاریخ کے بعد مطلوب تاریخ بنے گی، اور انسان کی تاریخ عملاً صحیح رخ پر سفر کرتی رہے گی، اور وہ بڑے بڑے نتائج تک پہنچے گی۔

دجال کا فتنہ

حدیث کی اکثر کتابوں میں آیا ہے کہ قیامت سے پہلے ایک شخص ظاہر ہوگا۔ اس کے لیے حدیث میں دجال کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ تیس ایسے لوگ آئیں گے جو دجال کذّاب ہوں گے۔ انگریزی میں دجال کو امپوسٹر (imposter) کہہ سکتے ہیں۔ دجال کا لفظ اگر چہ قرآن میں نہیں آیا ہے، لیکن معنی کے اعتبار سے وہ قرآن میں موجود ہے۔ شیطان کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ وہ تزیین کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے:

قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ (15:39)۔

یعنی، ابلیس نے کہا، اے میرے رب، جیسا تو نے مجھ کو گمراہ کیا ہے اسی طرح میں زمین میں ان کے لیے مزین کروں گا اور سب کو گمراہ کر دوں گا۔

He said, "My Lord, since You have let me go astray. I shall make the path of error seem alluring to them on the earth and shall mislead them all.

اس لحاظ سے غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ دجال قرآن کی زبان میں مزیّن اکبر ہوگا، یعنی سب سے بڑا فریبی۔ دجال، امت مسلمہ کا ایک فرد ہوگا، لیکن وہ امت کے بعد کے زمانے میں آئے گا۔ گویا کہ تاریخی طور پر اس زمانے میں جب کہ امت زوال کا شکار ہو چکی ہوگی۔ زوال کے زمانے میں کسی امت کے اندر جو نفسیات بنتی ہے، وہ شکست خوردگی کی نفسیات (defeatist mentality) ہوتی ہے۔ یہ زمانہ وہ ہوتا ہے جب کہ امت اس قابل نہیں رہتی کہ وہ عملاً اپنی شکست کو فتح میں تبدیل کر سکے۔ اس لیے امت کے اندر ایسے افراد ابھرتے ہیں، جو امت کو فرضی فخر (false pride) کی غذا دیں، جن کی لفظی باتوں سے متاثر ہو کر امت یہ سمجھے کہ وہ اس کے مخالفین کے مقابلے میں ڈیفنڈر (defender) کا رول ادا کر رہے ہیں۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امت کے دورِ زوال میں جو شخص ڈیفنڈر کی حیثیت سے ابھرے گا۔ وہ حقیقت کے اعتبار سے ڈیفنڈر کا رول ادا کرنے والا نہ ہوگا، بلکہ وہ دجل (to deceive)

کے لبادہ میں ظاہر ہوگا۔ یعنی امت دھوکہ کھا کر اس کو اپنا ڈیفنڈر سمجھ لے گی۔ حالاں کہ وہ ڈیفنڈر نہیں، بلکہ فریبی (deceiver) ہوگا۔

احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں امت کا ایک شخص ظاہر ہوگا، جو دجال کو قتل کرے گا (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 4321)۔ غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ قتل جسمانی قتل نہ ہوگا، بلکہ وہ نظریاتی قتل ہوگا۔ یعنی اس معنی میں کہ وہ شخص دلائل کے ذریعہ اکسپوز (expose) کرکے بتائے گا کہ یہ شخص ڈیفنڈر نہیں ہے، بلکہ وہ امپوسٹر ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ دجال ایک نہیں ہوگا، بلکہ بڑے دجال سے پہلے تیس دجال ظاہر ہوں گے (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 4333)۔ اس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ دجال ایک انفرادی کردار نہیں ہوگا، بلکہ وہ ایک تسلسل کا نقطۂ انتہا (culmination) ہوگا۔ دجال سے پہلے مختلف قسم کے افراد اٹھیں گے، جو گویا بڑے دجال کے لیے ابتدائی زمین تیار کریں گے۔ مثلاً پہلے مناظر (debator) قسم کے افراد ابھریں گے، اس کے بعد ایسے افراد ابھریں گے جن کو ملت اپنے دشمنوں کے مقابلے میں ڈیفنڈر کا درجہ دے گی، آخر میں بڑا دجال ظاہر ہوگا۔ جس کو لوگ اپنا نجات دہندہ (saviour) سمجھیں گے۔

بڑے دجال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ذاتی اعتبار سے غیر معمولی شخصیت کا مالک ہوگا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے زمانے میں ایسے حالات اور وسائل پیدا ہوں گے، جو اس کو موقع دیں گے کہ وہ عملاً بڑے دجال کا درجہ حاصل کرلے۔ مثلاً یہ کہ اس کے زمانے میں عالمی کمیونی کیشن وجود میں آجائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: يُنَادي بصَوْتٍ لَهُ يُسْمِعُ بِهِ مَا بَيْنَ الْخَافِقَيْنِ (کنز العمال، حدیث نمبر 39709)۔ یعنی دجال ایک ایسی آواز سے پکارے گا، جو مشرق اور مغرب کے دونوں سروں کے درمیان سنائی دے گی۔

مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ عام انسان جیسا نہیں ہوگا، وہ کوئی ہمالیائی شخصیت ہوگا۔ بلکہ اس سے مراد امت کے زوال کی ایک حالت ہے۔ اپنے زوال کی بنا پر دجال کی باتیں امت کی نفسیات کو ایڈریس کریں گی۔ دجال کی مقبولیت اس بنا پر نہیں

ہوگی کہ وہ جسمانی اعتبار سے کوئی غیر معمولی انسان ہوگا۔ بلکہ اس کا سبب امت کی زوال یافتہ نفسیات ہوگی۔ جو اپنی بگڑی ہوئی نفسیات کی بنا پر فرضی طور پر دجال کو اپنا نجات دہندہ سمجھ لے گی۔

ایک حدیث میں آیا ہے: لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى لَا يُقَالَ فِي الْأَرْضِ: اللهُ اللهُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 148)۔ یعنی قیامت اس وقت آئے گی، جب زمین پر کوئی اللہ اللہ کہنے والا باقی نہیں رہے گا۔ اس سے مراد دنیا کی عام قومیں نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد امت مسلمہ ہے۔ مزید یہ کہ اللہ اللہ نہ کہنے کا مطلب لفظی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ امت مسلمہ کا اللہ رب العالمین سے عارفانہ تعلق ختم ہوجائے گا، اور غیر اللہ ان کے لیے اصل کنسرن (sole concern) کی حیثیت اختیار کرلے گا۔

قرآن کے مطابق، انسان سے سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے، وہ یہ ہے کہ انسان اللہ رب العالمین کو اپنا سول کنسرن (sole concern) بنائے۔ اس کو حبِّ شدید کا تعلق صرف اللہ رب العالمین سے ہو۔ مگر ہر زمانے میں اور آج بھی انسان کی یہ کمزوری رہی ہے کہ وہ اللہ رب العالمین کو غیر مشہود پا کر کسی نہ کسی غیر خدا کو اللہ رب العالمین کے مقام پر بٹھاتا رہا ہے۔ کسی نہ کسی غیر خدا کو وہ اپنا سول کنسرن (sole concern) بناتا رہا ہے۔ مثلاً:

The transfer of the divine seat from God to Nature.
The transfer of the divine seat from God to King.
The transfer of the divine seat from God to Holymen.
The transfer of the divine seat from God to Dollar.
The transfer of the divine seat from God to Self.
The transfer of the divine seat from God to Children.

مسلم دنیا میں اللہ سے عارفانہ تعلق ختم ہونے کا حادثہ اچانک پیش نہیں آیا ہے، یہ حادثہ ایک لمبے پراسس کے تحت پیش آیا ہے۔ اسلام کے دورِ اول میں ایشیا اور افریقہ میں جب مسلمانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم نہیں ہوئی تھیں، اس وقت مسلمانوں کا اعتماد صرف اللہ پر ہوتا تھا۔ اس کے بعد جب مسلمانوں کی سلطنتیں قائم ہوگئیں تو مسلمانوں کا اعتماد اللہ پر کمزور ہوگیا۔ اب وہ مسلم سلطنتوں پر شعوری یا غیر شعوری طور پر اعتماد کرنے لگے۔ یعنی ٹرانسفر آف ڈیوائن سیٹ فرام اللہ ٹو مسلم پولٹکل پاور:

The transfer of divine seat from God to Muslim political power.

اس کے بعد انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں جب مغربی قوموں کو عروج حاصل ہوا، اور مغل ایمپائر اور ٹرکش ایمپائر جیسی مسلم سلطنتیں ختم ہوگئیں۔ تو اس اعتبار سے مسلم دنیا میں ایک سیاسی خلا پیدا ہوگیا۔ اس سیاسی خلا کی بنا پر مسلمانوں کے اندر خوف کی نفسیات پیدا ہوگئی۔ اب ان کا کنسرن اپنی ملت پر قرار پایا۔

اس سیاسی خلا کو پُر کرنے کے لیے مسلمان زیادہ سے زیادہ اپنی ملت کی طرف مائل ہونے لگے۔ ان کے اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ ذہن بنا کہ اب ان کے لیے بائنڈنگ فورس صرف ان کی اپنی ملت ہے۔ اس طرح مسلمان نفسیاتی اعتبار سے دوسری قوموں سے دور اور مسلمانوں سے قریب آنے لگے۔ اس کے نتیجے میں فطری طور پر مسلمانوں کا یہ مزاج بنا کہ مسلم اور غیر مسلم کے بارے میں جو آدمی مسلمانوں کی یک طرفہ حمایت کرے، وہ ان کا اپنا آدمی ہے، اور جو مسلمانوں کی یک طرفہ حمایت نہ کرے، وہ عملاً ان کے حریف کا ساتھی ہے۔ اس طرح مسلمانوں کے لیے غیر شعوری طور پر عملاً مسلم قوم اصل کنسرن (sole concern) بن گئی۔

اسی قسم کی فضا ہے جس میں دجال ابھرے گا۔ وہ مسلمانوں کی اس نفسیات کو فیڈ کرے گا۔ وہ تمام مسائل میں یک طرفہ طور پر غیر مسلم قوموں کو اور غیر مسلم میڈیا کو ذمہ دار ٹھہرائے گا۔ اور مسلمانوں کو یک طرفہ طور پر بے قصور ظاہر کرے گا۔ اس بنا پر مسلمان یہ سمجھیں گے کہ وہی ان کا اپنا آدمی ہے۔ وہی ان کے مفاد کی حفاظت کرنے والا ہے۔ یہ مزاج بڑھ کر یہاں تک پہنچے گا کہ وہ دجال کو اپنا نجات دہندہ سمجھ لیں گے۔

جب مسلمانوں میں اللہ پر اعتماد موجود ہو تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ خوف کی حالت ان کے تعلق باللہ میں اضافہ کرنے والا بن جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

> الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ (3:173)۔ یعنی جن سے لوگوں نے کہا کہ دشمن نے تمہارے خلاف بڑی طاقت جمع کرلی ہے اس سے ڈرو، لیکن اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کردیا اور وہ بولے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

دجال کے فعل کو دجل (دھوکا اور فریب) کیوں کہا گیا۔ کیوں کہ وہ اسلام کے نام پر مسلمانوں کو اسلام سے دور کرے گا۔ وہ اسلام کے نام پر غیر اسلام کو فروغ دے گا۔ دجال کی پوری سرگرمیوں کا مرکز یہ ہوگا کہ وہ مسلمانوں کے مفروضہ دشمنوں کو دین کا لیبل لگا کر عوامی زبان میں للکارے گا۔ وہ اسٹیج کے میدان میں بظاہر مفروضہ دشمنوں کو شکست دے گا۔ غلط طور پر مسلمانوں کو یہ باور کرائے گا کہ ہم نے تمھارے دشمنوں کو زیر کر دیا ہے۔ مگر دجال کا یہ سارا معاملہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلام دشمنی کا معاملہ ہوگا۔ کیوں کہ اس کی باتیں مسلمانوں کی توجہ کو اللہ کے بجائے، غیر اللہ کی طرف مائل کر دے گی۔

مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کرنے والا وہ ہے، جس کی رہنمائی سے مسلمانوں میں اللہ پر یقین بڑھے۔ ان کے اندر اللہ کا تقویٰ پیدا ہو، وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے والے بن جائیں۔ ان کو سب سے زیادہ شوق جنت کا ہو۔ ان کا سب سے زیادہ اہتمام آخرت کے لیے ہو جائے۔ وہ اپنی زندگی میں وَلَمۡ یَخۡشَ إِلَّا اللہ (9:18) کے مصداق بن جائیں، یعنی وہ اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔

مگر برعکس طور پر ان کے ساتھ یہ واقعہ پیش آئے گا کہ مثلاً وہ دجال کی منفی باتوں سے دھوکہ میں آ کر دوسری قوموں سے نفرت کرنے لگیں گے۔ دوسری قوموں کو وہ اپنا دشمن اور سازشی سمجھنے لگیں گے۔ وہ غلط طور پر یہ فرض کر لیں گے کہ ان کے ہر مسئلے کا ذمہ دار دوسری قومیں ہیں۔ اس طرح وہ اسلام کے نام پر غیر اسلامی سرگرمیوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس کے نتیجے میں ان کے اندر انسانوں کو خدا کے منصوبۂ تخلیق سے آگاہ کرنے کا ذہن بالکل ختم ہو جائے گا۔ کیوں کہ یہ اسپرٹ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ مسلمانوں کے اندر عام انسان کے لیے خیر خواہی کا جذبہ ہو۔ جب کہ دجال مسلمانوں کے اندر سے انسانی خیر خواہی کا کلی خاتمہ کر دے گا۔

احیائے اسلام کا مطلب ہے، تبدیلی زمانہ کے اعتبار سے اسلام کا
مطالعہ کر کے اس کو سمجھنا، اور اپلائی کرنا۔

آیات کا ظہور

حدیث میں دجال کو تاریخ کا عظیم ترین فتنہ بتایا گیا ہے۔ دجال کے بارے میں روایتیں حدیث کی تقریباً تمام کتابوں میں آئی ہیں۔ ان روایتوں کے گہرے مطالعے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دجال کسی فرد واحد کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک دجالی دور کا نام ہے۔ یہ دور غالباً وہی ہے جس کو مغربی تہذیب کا دور کہا جاتا ہے۔ دجال کے لیے جن غیر معمولی طاقتوں کا ذکر ہے، وہ سب تمثیل کے معنی میں ہیں، اور یہ وہی طاقتیں ہیں جو جدید دور میں ٹکنالوجی کی ترقی سے انسان کو حاصل ہوئی ہیں۔

مثلاً حدیث میں آیا ہے: يُنَادِي بِصَوْتٍ لَهُ يُسْمِعُ بِهِ مَا بَيْنَ الْخَافِقَيْنِ (کنز العمال، حدیث نمبر 39709)۔ یعنی وہ ایسی آواز میں پکارے گا، جو مشرق و مغرب کے درمیان سنائی دے گی۔ اس سے مراد واضح طور پر جدید کمیونی کیشن ہے۔ اس کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا ہے کہ آدمی ایک مقام سے بولے، اور اسی وقت تمام دنیا میں اس کی آواز سنی جاسکے۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے: قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ، وَمَا إِسْرَاعُهُ فِي الْأَرْضِ؟ قَالَ: كَالْغَيْثِ اسْتَدْبَرَتْهُ الرِّيحُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2937)۔ یعنی، ہم لوگوں نے پوچھا کہ زمین میں اس کی رفتار کیسی ہوگی، آپ نے کہا: جیسے بارش جس کو تیز آندھی اڑا لے جاتی ہو۔ اس سے مراد واضح طور پر ہوائی سفر (air travel) ہے۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے: مَعَهُ جَبَلٌ مِنْ خُبْزٍ، وَنَهْرٌ مِنْ مَاءٍ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 14292)۔ یعنی اس کے ساتھ روٹی کا پہاڑ اور پانی کا دریا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں وسائلِ حیات کا انفجار (explosion) ہوگا۔ اس کے نتیجے میں اسبابِ حیات کی بہت زیادہ فراوانی ہوجائے گی۔ مثلاً دستی زراعت کے بجائے مشینی زراعت کا ممکن ہوجانا، ڈی سالینیشن (desalination) کے ذریعہ سمندر کے پانی کا میٹھے پانی میں تبدیل ہونا، وغیرہ۔

دجال کا دور غالباً وہی دور ہے جب کہ آفاق و انفس کی آیات (دلائل) بڑے پیمانے پر ظاہر ہوں گی، اور حق کی اعلیٰ تبیین ممکن ہوجائے گی (فصلت، 41:53)۔ لیکن عین اسی زمانے میں دجالی ذہن کے لوگ بہت بڑے پیمانے پر غلط تعبیر (misinterpretation) کا کام کریں گے، اور ظاہر ہونے والے دلائل کو خالق کا کارنامہ بتانے کے بجائے یہ کریں گے کہ ان کو مخلوق کی طرف منسوب

کر دیں گے، اور اس طرح حقیقت کے ظہور کامل کے دور میں بھی لوگوں کو غلط تعبیرات میں بھٹکا دیں گے۔ غالباً یہی وہ ظاہرہ ہے جس کو حدیث میں فتنہ دہیماء (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 4242) کہا گیا ہے، یعنی بڑے اندھیرے (utter darkness) کا دور۔

حقائق کی غلط تعبیر کیا ہوگی۔ وہ یہ ہے کہ علم کے تمام اداروں اور ریسرچ کے تمام شعبوں کو اس طرح منظم کیا جائے گا کہ ان کی تحقیقات انسان کے لیے خدا کی معرفت بننے کے بجائے، خدا کے وجود کا انکار یا اس سے بے خبری کا ذریعہ بن جائیں۔ مثلاً زندگی کیسے وجود میں آئی، حیوان اور انسان کیسے بنے، اس کے بارے میں حیاتیاتی ارتقا (biological evolution) کا نظریہ وضع کیا جائے گا، اور ان کو اتنا زیادہ عام کیا جائے گا کہ ہر تعلیمی ادارہ اور ہر لائبریری میں اسی نظریہ کی گونج سنائی دے گی۔ اسی طرح مادہ (matter) کے اندر مختلف خواص کیوں ہیں، ان کے بارے میں یہ نظریہ وضع کیا گیا کہ یہ سب فطرت کے داخلی قوانین (inherent laws of nature) کا نتیجہ ہے۔ اس قسم کے بے خدا (godless) نظریات کو علم کے مختلف شعبوں کے ذریعہ اتنا زیادہ پھیلایا گیا کہ تقریباً پوری دنیا میں ان نظریات کو شعوری یا غیر شعور طور پر برحق مان لیا گیا۔

دجال کے بارے میں حدیث میں دو اہم باتیں آئی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک رجلِ مومن اس کا کامیاب مقابلہ کرے گا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2938)، دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح، دجال کو قتل کریں گے (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2244)۔ یہ بات غالباً دو فرد کی بات نہیں ہے، بلکہ دو گروہ کی بات ہے۔ دجال کے فتنہ کا خاتمہ غالباً دو گروہ کریں گے، ایک غالباً پیروانِ محمد کے منتخب افراد کا گروہ، اور دوسرا غالباً پیروانِ مسیح کے منتخب افراد کا گروہ۔

مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ”قتل دجال“ یا دجالی فتنہ کے خاتمے کا آغاز عملاً واقع ہو چکا ہے۔ اس معاملے میں مسیحی اہل علم نے بڑے پیمانے پر دجالی فتنے کے علمی مقابلہ کا کام کیا ہے۔ مثلاً دجالی فتنہ کے دوران ایک خطرناک نظریہ پیدا ہوا، جس کو ہیومنزم کہا جاتا ہے۔ ہیومنزم کا خلاصہ ایک شخص نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے — خدا کی سیٹ پر انسان کو بٹھانا:

Transfer of seat from God to man.

اس نظریے کی تائید میں سیکولر لوگوں نے بڑی تعداد میں کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب یہ ہے:

Man Stands Alone by Julian Huxley (1941)

خدا کے انکار پر جب یہ کتاب چھپی تو اس کے بعد امریکا کے ایک مسیحی سائنس داں نے اس کے جواب میں مدلل کتاب شائع کی۔ وہ کتاب یہ تھی:

Man Does Not Stand Alone by Abraham Cressy Morrison, Fleming H. Revell Company, 1944.

اسی طرح دیگر مسیحی اہل علم نے بھی بڑی تعداد میں کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب وہ ہے، جو چالیس سائنس دانوں کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

The Evidence of God in an Expanding Universe. Edited by John Clover Monsma, Published: 1958.

سائنس کا موضوع کائنات (physical world) کا مطالعہ ہے۔ تقریباً چار سو سال کے مطالعے کے ذریعے سائنس نے جو دنیا دریافت کی ہے، وہ استنباط (inference) کے اصول پر خالق کے وجود کی گواہی دے رہی ہے۔ لیکن غالباً کسی سائنسداں نے کھلے طور پر خدا کے وجود کا اقرار نہیں کیا ہے۔ ان کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ البرٹ آئن سٹائن (1879-1955) کی طرح ان کا کیس کھلے طور پر خدا کے انکار (atheism) کا کیس نہیں ہے، بلکہ ان کا کیس لا ادری (agnosticism) کا کیس ہے۔ کوانٹم فزکس کے نظریے کو اگر اس معاملے پر منطبق کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے:

Probably there is a God.

یہ خالص سائنس کا موقف ہے۔ لیکن جہاں انسان کے وجدان (intuition) کا تعلق ہے۔ اس کی سطح پر خدا کا وجود اتنا ہی یقینی ہے، جتنا کہ انسان کا وجود۔ مشہور فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ (René Descartes, 1596-1650) نے کہا تھا کہ میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں:

I think therefore I am. (*Discourse on the Method*, Inroduction, p. 18)

اس اصول کو توسیع دیتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہوگا — میرا وجود ہے، اس لیے خدا کا بھی وجود ہے:

I am, therefore God is.

یہود کی مثال

قرآن میں یہود کی تاریخ کا ایک نصیحت آمیز واقعہ سورۃ الاسراء کی ابتدائی چند آیتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ان آیات کا ترجمہ یہ ہے: اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں بتا دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں خرابی کروگے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ پھر جب ان میں سے پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے بندے بھیجے، نہایت زور والے۔ وہ گھروں میں گھس پڑے اور وعدہ پورا ہو کر رہا۔ پھر ہم نے تمہاری باری ان پر لوٹا دی اور مال اور اولاد سے تمہاری مدد کی اور تم کو زیادہ بڑی جماعت بنا دیا۔ اگر تم اچھا کام کروگے تو تم اپنے لیے اچھا کروگے اور اگر تم برا کروگے تب بھی اپنے لیے برا کروگے۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے اور بندے بھیجے کہ وہ تمہارے چہرے کو بگاڑ دیں اور مسجد میں گھس جائیں جس طرح وہ اس میں پہلی بار گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا زور چلے اس کو برباد کردیں (17:4-7)۔

قرآن کی ان آیتوں میں یہود کے بگاڑ کا ذکر ہے۔ لیکن اس کے بعد یہ نہیں فرمایا کہ یہود کے اندر ہم نے مصلحین پیدا کیے۔ بلکہ یہ فرمایا کہ ان کے خلاف ہم نے اپنے زور آور بندے بھیجے، جنھوں نے ان کو تباہ و برباد کیا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ یہود (بنی اسرائیل) کی تاریخ میں دو بار یہ واقعہ پیش آیا۔ ان کو ایک بار 586 قبل مسیح میں بابل ونینوا کے بادشاہ نبوکد نضر (Nebuchadnezzar) کے ہاتھوں تباہی کا سامنا کرنا پڑا، اور دوسری بار 70 عیسوی رومی بادشاہ رومی بادشاہ ٹائٹس (Titus) کے زمانہ میں۔ ان دونوں نے قوم یہود کو فلسطین کے علاقے سے نکال کر بیرونی علاقے میں جلاوطن کردیا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، تفسیر ماجدی، سورۂ بنی اسرائیل، آیت 4)۔ یہی وہ لوگ ہیں، جن کو تاریخ میں ڈائسپورا (diaspora) کہا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، وہ بظاہر سزا کا معاملہ تھا، لیکن اصلاً اس کا مقصد یہ تھا کہ قدیم زمانے میں یہودی نسلوں میں جو زوال آ گیا تھا، اس کو توڑا جائے، اور یہود کو دوبارہ یہ موقع دیا جائے کہ وہ اپنی نسلوں کے اندر بیداری لائیں، اور ان کو احیا (revival) کا موقع مل سکے۔ یہ خدائی قانون بشمول امت مسلمہ دنیا کی تمام قوموں کے لیے یکساں طور پر لاگو ہے۔

ہارش ٹریٹمنٹ (harsh treatment) کا یہ عمل یہود کے ساتھ کئی سو سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ 1948 میں ان کو دوبارہ یہ موقع دیا گیا کہ وہ فلسطین کے علاقے میں لوٹ کر آئیں، اور اپنی نئی زندگی شروع کریں۔ بدقسمتی سے بنواسرائیل کی یہ واپسی مثبت واپسی نہ بن سکی۔ اس واپسی کے ساتھ یہودیوں اور عربوں کے درمیان ایک خونی تصادم شروع ہوگیا، اور اس طرح وہ امکان واقعہ نہ بن سکا، جو اس معاملہ میں چھپا ہوا تھا۔

اگر مسلمان یہود کو سیاسی دشمن سمجھنے کے بجائے مدعو سمجھتے، اور خیر خواہی کے ساتھ ان کے درمیان خدائی پیغام پہنچانے کا کام کرتے تو عین ممکن تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ جزئی یا کلی طور پر وہی واقعہ پیش آتا جو اس آیت میں مذکور ہے:

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۔ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (41:33-34)۔ یعنی، اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہوگیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔

اس کے برخلاف، یہ سوچ لینا کہ اب قوم یہود کے لیے سچائی کے راستے پر آنے کا کوئی امکان نہیں ہے، ایک غیر پیغمبرانہ سوچ ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں کے راہِ راست پر آنے کے حوالے سے ہمیشہ پرامید رہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ عہدِ رسالت سے لے کر اب تک ہر دور میں یہودیوں نے خدا کے فائنل پیغام کو دریافت کرکے اس کو قبول کیا، اور اب بھی قبول کر رہے ہیں۔ مثلاً آسٹریا کے لیو پولڈ اسد (1900-1992)، اور امریکا کی مارگریٹ جمیلہ (1934-2012)۔ اسی طرح اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہود کے معاملے میں قرآن کی مذکورہ آیت (فصلت، 41:33-34) منطبق (apply) نہیں ہوتی ہے۔

قرآن کے اس حکم سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو امتِ وسط کی حیثیت سے یہ حق نہیں کہ وہ ابدی طور پر یہود کو ملعون سمجھ لیں۔ مسلمانوں کا رویہ یہود کے بارے میں ہمیشہ قابلِ نظرثانی ہونا چاہیے، نہ کہ نماز روزے کی طرح ابدی حکم۔

بامقصد زندگی

ایک بار میری ملاقات ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ہوئی۔ بات چیت کے دوران انھوں نے کہا کہ ہم لوگ تو حیوان کاسب (earning animal) ہیں۔ یعنی پڑھ لکھ کر ڈگری لینا، اور اس کے بعد پیسہ کمانا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں کے لیے دو اچھے آپشنز (options) ہیں۔ ایک ہے، ون مین، ون مشن (one man, one mission)، اور دوسرا ہے، ون مین، ٹو مشن (one man, two mission)۔ ان دونوں قسم کی زندگی کو اچھی زندگی کہا جائے گا۔

اصل یہ ہے کہ انسان کا ایک سوچا سمجھا مقصد ہو، اور وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول میں لگ جائے۔ ایسے انسان کے لیے ایک کام تو یہ ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کے مطابق، کسبِ مال کرے، اور پھر اپنی ضرورت کے مطابق اپنی کمائی کا استعمال کرے۔ ایسے انسان کے لیے دو طریقے ہیں۔ ایک، یہ ہے کہ وہ اپنا سارا وقت اپنے مقصد کے لیے وقف کردے، اور کمائی کے معاملے کو ثانوی (secondry) بنا دے، اور دوسرا یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کا آدھا حصہ کمائی میں لگائے، اور آدھا حصہ اس کام میں جس کو اس نے اپنا مقصدِ حیات بنایا ہو۔ یہ دونوں طریقے یکساں طور پر درست طریقے ہیں۔

آدمی ہمیشہ اپنے آپ کو دو چیزوں کے درمیان پاتا ہے۔ ایک، اپنی اور اپنی فیملی کے تقاضے۔ دوسرا، اپنی زندگی کے اصل مقصد کے تقاضے۔ آدمی اگر کسی ایک چیز کی طرف مکمل طور پر جھک جائے، تو وہ اس قابل نہیں رہے گا کہ اپنی زندگی کے دوسرے تقاضے کو پورا کر سکے۔ اس لیے قابلِ عمل بات یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دو چیزوں کے درمیان بانٹ لے۔ آدھا مقصدی تقاضے کے لیے، اور آدھا مادی ضروریات کے تقاضے کے لیے۔ اس طرح دونوں تقاضے پورے ہوتے رہیں گے، اور وہ بقدرِ ضرورت ایک کامیاب انسان بن سکے گا، یعنی وہ اپنے آپ کو اس اصول پر قائم کرلے، جس کو میں ون مین ٹو مشن (one man two mission) سے تعبیر کرتا ہوں۔

طریقِ مطالعہ

ایک صاحب نے ہمارے واٹس ایپ پر درج ذیل میسج بھیجا ہے:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، اسکالرز اور مفسرین کو پڑھنے کے حوالے سے میرا یہ طریقہ ہے کہ میں پڑھتا سب کو ہوں، یا یوں کہہ لیجیے کہ جس جس کو پڑھنے سننے کا جب جب موقع ملتا ہے اسے پڑھتا سنتا ہوں، اور مختلف افراد کے زیر مطالعہ افکار کے ساتھ وہ کرتا ہوں جو اس مثال سے واضح ہو جائے گا: جس طرح ایک گائے گھاس کھاتی ہے، مختلف قسم کا چارہ وغیرہ کھاتی ہے، پانی پیتی ہے، اس کے بعد اس کے معدے کا نظام غیر مفید اور غیر ضروری چیزوں کو خارج کر دیتا ہے اور صرف مفید اور کارآمد چیزوں کو ہضم کرتا ہے اور پھر اس سب کے نتیجے میں گائے دودھ جیسی عظیم اور مفید چیز نکالتی ہے۔

اسی طرح میں پڑھتا سب کو ہوں، اور جو بات ضروری اور اہم بلکہ قرآن مجید اور سنتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق ملے اس کو لے لیتا ہوں، اور باقی باتوں کو چھوڑ دیتا ہوں۔ یعنی میں کسی مصنف یا اسکالر کی کتابوں سے استفادہ ضرور کرتا ہوں لیکن کسی کتاب سے اس حد تک متاثر نہیں ہوا کرتا جس طرح لوگوں کی اکثریت کسی اسکالر سے متاثر ہوتی ہے اور پھر اس کی فالوور بن جاتی ہے۔ میرا یہ طریقِ مطالعہ کس حد تک درست ہے، اس سلسلے میں مجھے آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔ (ایک قاریِ الرسالہ)

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ گائے کا تقابل انسانی رویے سے کرنا درست نہیں۔ گائے مکمل طور پر خدا کے فطری قانون کے مطابق عمل کرتی ہے۔ لیکن انسان اپنے معاملے میں اپنے ارادہ و اختیار کے مطابق عمل کرتا ہے۔

آپ کا جو طریقہ ہے، وہی موجودہ زمانے میں اکثر تعلیم یافتہ لوگوں کا طریقہ ہے۔ یہ طریقہ بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے۔ اس طریقے کی غلطی یہ ہے کہ آدمی بظاہر یہ کہتا ہے کہ وہ ہر ایک کو پڑھتا ہے، لیکن وہ خود اپنے آپ کو کرائٹیرین (criterion) بنا لیتا ہے۔ اس لیے اس طرح کا پڑھنا اپنے آپ کو پڑھنا ہوتا ہے، نہ کہ سب کو پڑھنا۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے آبجیکٹیو انداز میں قرآن وسنت کی روشنی میں یہ جاننے کی کوشش کی

جائے کہ خالص قرآن وسنت کے اعتبار سے صحیح طریقہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر آپ اپنے طریقے کے مطابق، سیرت کی کوئی کتاب پڑھتے ہیں۔ اس میں آپ کو غزوات کے عنوان سے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو یہ غزوات ہرگز جنگ کے معنی میں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی بیشتر تعداد جنگ کو اوائڈ کرنے کے معنی میں تھی۔

فریقِ ثانی نے اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ میں الجھانا چاہا تو آپ نے یہ کوشش کی کہ فریقِ ثانی کی طرف سے ہونے والے جنگی اقدامات کو جھڑپ (skirmishes) میں تبدیل کردیا جائے۔ گویا جھڑپ (skirmish) کے واقعات کو سیرت نگاروں نے غزوات کا نام دیا ہے۔ حالاں کہ وہ پریکٹکل وزڈم کا استعمال کرکے جنگ کو اوائڈ کرنے کی ایک عظیم مثال ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ نے جو کیا وہ یہ تھا کہ آپ نے حکیمانہ طریقہ اختیار کرتے ہوئے جنگی اقدام کو جھڑپ میں تبدیل کردیا۔ جیسا کہ خندق کے موقع پر ہوا۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو کسی ماحول میں زندگی گزارتا ہے۔ اس ماحول کے زیرِ اثر ہر ایک انسان کا اپنا ایک ذہنی سانچہ (mindset) بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اِسی بنے ہوئے ذہن (conditioned mind) کے تحت چیزوں کو دیکھتا ہے اور رائے قائم کرتا ہے۔ اِسی مائنڈ سیٹ کو قرآن میں شاکلہ (17:84) کہا گیا ہے۔ قرآن وسنت کو درست انداز میں سمجھنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے اِس خودساختہ شاکلہ کو توڑے اور ربانی شاکلے کی روشنی میں وہ دین کا مطالعہ کرے۔ اس کے بعد یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے مطالعے سے درست نتیجہ اخذ کرسکے۔

سبق کی اہمیت

ولیم ہنری بِل گیٹس (پیدائش 1955) مشہور امریکی دولت مند ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے تجربات کی روشنی میں کہا — اپنی خوشی کا جشن منانا اچھا ہے، مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آپ اپنی ناکامی سے سبق سیکھیں:

It is fine to celebrate success, but it is more important to heed lessons of failure.

لکھنے کا کلچر

مولانا سید سلیمان ندوی (1884-1953) جب ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں استاد تھے، تو ان سے ان کے ایک طالب علم نے سوال کیا کہ کب لکھنا چاہیے۔ اس پر انھوں نے نصیحت کرتے ہوئے کہا: اتنا پڑھو، اتنا پڑھو کہ ابلنے لگے، اس کے بعد لکھو۔ یہ ایک صاحب تصنیف عالم کا نہایت کارآمد مشورہ ہے۔ لیکن یہ مطالعہ کسی موضوع پر علمی انداز میں ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر آپ یہ کریں کہ صبح سے شام تک اردو اخبارات پڑھیں، اور پھر مضمون لکھنے بیٹھ جائیں تو ایسے مضمون میں کوئی گہرائی نہیں ہوگی۔ سرسری مطالعہ سے سرسری مضمون لکھنا آئے گا، اور گہرے مطالعہ سے گہرے مضمون لکھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

گہرا مطالعہ کرنے سے آدمی کے اندر گہری سوچ پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ زیادہ گہرے انداز میں معاملات پر رائے قائم کرے۔ اس کی رائے میں میچوریٹی آجاتی ہے۔ معروف انگریزی رائٹر فرانسس بیکن (Francis Bacon, 1561-1626) کا مشہور قول ہے کہ بعض کتابیں صرف ورق گردانی کے لیے ہوتی ہیں، کچھ سرسری مطالعے کے لیے ہوتی ہیں، اور چند ایک کا گہرا مطالعہ کیا جاتا ہے:

> Some books are to be tasted, others to be swallowed, and some few to be chewed and digested. (*The Essays*, Oxford, 1890, p. 342)

ایک کتاب اور دوسری کتاب میں یہ فرق اسی لیے پیدا ہوتا ہے کہ کوئی لکھنے والا کتاب کو گہرے مطالعے کے بعد لکھتا ہے، اور کوئی سرسری مطالعے کے بعد کتاب چھاپ دیتا ہے۔ مطالعے کے اسی فرق کی وجہ سے کتاب میں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اگر کتاب لکھو تو ایسی کتاب لکھو کہ جس کو پڑھا جائے۔ جو کتاب بازار میں جاکر ردّی میں فروخت ہوجائے، ایسی کتاب لکھنے کا کیا فائدہ۔ موجودہ زمانے میں پرنٹنگ پریس، اور پھر ای ریڈرز، وغیرہ کی ایجاد کے بعد مطالعہ کرنا بہت آسان ہوگیا ہے۔

لو پروفائل، ہائی پروفائل

غزوہ خیبر کا ایک سبق آموز واقعہ حدیث کی کتابوں آیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ أَبِي مُوسَى، قَالَ: كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي غَزَاةٍ، فَجَعَلْنَا لاَ نَصْعَدُ شَرَفًا، وَلاَ نَعْلُو شَرَفًا، وَلاَ نَهْبِطُ فِي وَادٍ إِلَّا رَفَعْنَا أَصْوَاتَنَا بِالتَّكْبِيرِ، قَالَ: فَدَنَا مِنَّا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ، ارْبَعُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ، فَإِنَّكُمْ لاَ تَدْعُونَ أَصَمَّ وَلاَ غَائِبًا، إِنَّمَا تَدْعُونَ سَمِيعًا بَصِيرًا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6610)۔ یعنی ابوموسیٰ اشعری نے بیان کیا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں تھے اور ہم یہ کرنے لگے کہ جب ہم کسی بلندی پر چڑھتے یا بلندی پر پہنچ جاتے یا کسی نشیبی علاقہ میں اترتے تو بلند آواز سے تکبیر کہتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب ہمارے قریب آئے تو آپ نے کہا: اے لوگو، اپنے آپ پر رحم کرو، کیونکہ تم کسی بہرے یا غیر موجود کو نہیں پکارتے ہو، بلکہ تم اس ذات کو پکارتے ہو جو بہت زیادہ سننے والا بڑا دیکھنے والا ہے۔

یہ ایک مثال ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کا طریقہ کیا تھا۔ آپ ہمیشہ لو پروفائل (low profile) میں کام کرنا پسند کرتے تھے۔ ہائی پروفائل (high profile) میں کام کرنا پیغمبر اسلام کا پسندیدہ طریقہ نہ تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ الْخَفِيَّ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2965)۔ یعنی، بیشک اللہ تعالیٰ ایسے بندے سے محبت کرتا ہے، جو متقی ہو، دنیا سے بے نیاز ہو اور نمائش سے دور ہو۔

یہاں تک کہ اسلام میں عبادت کے معاملہ میں بھی لو پروفائل کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایسا صدقہ کرنے والا قیامت کے دن عرش کے سائے میں ہوگا، جو اپنے دائیں ہاتھ سے صدقہ کرے تو اس کے بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو: رَجُلٌ تَصَدَّقَ، أَخْفَى حَتَّى لاَ تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 660)۔

ایسا کیوں ہے۔ لو پروفائل کا مطلب ہے، پبلسٹی سے دور رہ کر کام کرنا۔ یعنی غیر نمایاں انداز میں کام کرنا کہ آپ کا حریف آپ کے کام کو اپنے لیے چیلنج نہ سمجھے۔ فریق ثانی آپ کے کام میں اپنے لیے خطرہ محسوس نہ کرے۔ فریق ثانی آپ کے معاملے کو اپنے لیے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کردے:

A position of avoiding or not attracting much attention or publicity. Intended to attract no attention or controversy.

یہ طریقہ بہت بڑی حکمت پر مبنی ہے۔ اس طریقہ کار کی حکمت یہ ہے کہ لو پروفائل میں کام کیا جائے تو اس سے ری ایکشن کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ آدمی کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ شروع سے آخر تک اپنا کام معتدل انداز میں جاری رکھے، اور حسب منشا اپنے منصوبے کو تکمیل تک پہنچائے۔

لو پروفائل میں کام کرنے کی صورت میں ایسا ہوتا ہے کہ فریق ثانی کو آپ کے کام کی خبر نہیں ہوتی۔ وہ آپ کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کا منصوبہ نہیں بناتا، وہ آپ سے ٹکراؤ کی کوشش نہیں کرتا۔ اس طرح آپ کو موقع مل جاتا ہے کہ آپ معتدل انداز میں اپنے منصوبوں کو مکمل کرسکیں۔ آپ کی پوری انرجی صرف اپنے منصوبے کی تکمیل میں استعمال ہو۔ غیر ضروری چیزوں میں ضائع ہونے سے بچ جائے۔ اس کے مقابلے میں ہائی پروفائل کا مطلب ہے، نمایاں انداز میں کام کرنا:

A position or approach characterized by a deliberate seeking of prominence or publicity. If someone has a high profile, people notice them and what they do. If you keep a low profile, you avoid doing things that will make people notice you.

ہائی پروفائل میں کام کرنا، ہمیشہ مسئلہ پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ فریق ثانی بہت جلد آپ کے عمل سے آگاہ ہوجاتا ہے، اور آپ کے مقابلے میں جوابی منصوبہ بندی شروع کردیتا ہے۔ اس طرح بہت جلد ایسا ہوتا ہے کہ آپ اور فریق ثانی کے درمیان چین ری ایکشن (chain reaction) شروع ہوجاتا ہے۔ لو پروفائل میں کام کرنے کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ آپ کا وقت اور آپ کی انرجی صرف اپنے منصوبے کی تکمیل میں استعمال ہوتی ہے۔ جب کہ ہائی پروفائل میں کام کرنے کی صورت میں آپ کے وقت اور آپ کی انرجی کا بڑا حصہ اصل مقصد میں لگنے کے بجائے جوابی کارروائی میں گزر جاتا ہے۔

ڈائری 1986

13 جولائی 1986

آج کل کچھ لوگ مجھے بے حد پریشان کیے ہوئے ہیں۔ ان باتوں کو سوچ کر اچانک میرا دل بھر آیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میری زبان سے نکلا:

جنھوں نے سورج اور چاند کی بڑائی کی ان کو لوگوں نے اوتار بنا لیا۔ جنھوں نے انسانوں کی بڑائی کی، ان کو اپنا بزرگ اور پیشوا بنا لیا۔ جنھوں نے قوم اور ملک کی بڑائی کی، ان کو اپنا لیڈر بنا لیا۔ میں نے ہر ایک کو چھوڑ کر صرف خدا کی بڑائی کی تو سارے لوگ میرے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ کیسی عجیب ہے یہ دنیا جہاں ہر بڑائی لوگوں کو گوارا ہے، مگر ایک خدا کی بڑائی کسی کو گوارا نہیں۔

میرے اوپر کوئی شخص یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ میں نے اللہ کی وحدت میں کوئی کمی کی۔ اللہ کے رسول کو نہیں مانا۔ آخرت کے حساب کتاب کا انکار کیا۔ میرے اوپر سارا الزام صرف یہ ہے کہ تم ہمارے اکابر پر تنقید کیوں کرتے ہو۔ مزید یہ کہ کوئی شخص آج تک یہ ثابت نہ کر سکا کہ میری تنقید قرآن و حدیث کے اعتبار سے غلط ہوتی ہے۔

کیسے عجیب ہوں گے وہ لوگ جن کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہ ہو تب بھی وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ بولیں۔ جو ایک بندہ کے اوپر دست درازی کا کوئی حق نہ رکھتے ہوں، پھر بھی وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اس پر لازماً دست درازی کریں۔

آہ، وہ انسان جو خدا کی پکڑ سے اتنا بھی نہیں ڈرتا، جتنا کوئی شخص چیونٹی کے کاٹنے سے ڈرتا ہے۔

14 جولائی 1986

12 اور 13 جولائی کو میں پٹنہ میں تھا۔ پٹنہ کے مدرسہ شمس الہدیٰ (قائم شدہ 1912) میں مجھے استقبالیہ دیا گیا۔ اس استقبالیہ کا آغاز اس جملہ سے ہوتا تھا— ہم عظیم آباد کے اس تاریخی شہر میں اپنے مہمان خصوصی کا استقبال کرتے ہیں۔

اورنگ زیب (1618-1707) کے ایک پوتے کا نام شہزادہ عظیم (1664-1712) تھا۔ اسی کے نام پر پٹنہ کا نام عظیم آباد رکھا گیا تھا۔ مگر انگریزوں کے زمانے میں وہ دوبارہ پٹنہ بن گیا۔ اس وقت سے آج تک تمام سرکاری کاغذات میں اس شہر کا نام پٹنہ ہی لکھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پٹنہ کسی ''پٹن دیوی'' کے نام سے ابتداءً موسوم ہوا تھا۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا یہ مزاج ان کے لیے غیر ضروری مسائل پیدا کرنے کا سبب بنا ہے۔ جس شہر کو ہندو متفقہ طور پر ''پٹنہ'' کہتے ہوں، اس کو ''عظیم آباد'' کا نام دینا غیر ضروری قسم کی نفسیاتی پیچیدگی پیدا کرنا ہے۔ اور ایک طبقہ کو یہ کہنے کا موقع دینا ہے کہ مسلمان اس ملک میں دوبارہ اورنگ زیب کا عہد واپس لانا چاہتے ہیں۔

1971 میں، میں پاکستان گیا تھا اور لاہور میں ٹھہرا تھا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ لاہور میں تقسیم سے پہلے ہندوؤں نے ایک کالونی بنائی تھی، جس کا نام انھوں نے کرشن نگر رکھا تھا۔ تقسیم کے بعد مسلمانوں نے اس کا نام بدل کر اسلام نگر رکھ دیا۔ دوسری طرف کشمیر میں ایک شہر ہے، جس کا پرانا نام اننت ناگ ہے۔ اس کا نام بھی مسلمانوں نے بطور خود بدل کر اسلام آباد رکھ چھوڑا ہے۔ سرکاری کاغذات میں یہ شہر اننت ناگ کہا جاتا ہے اور مسلمانوں کے خود ساختہ کاغذات میں اسلام آباد۔

مسلمانوں کا یہ معاملہ بھی عجیب ہے۔ وہ پاکستان میں بھی اسلام آباد بنانا چاہتے ہیں اور ہندستان میں بھی اسلام آباد۔ جو لوگ اتنے غیر حقیقت پسند ہوں، ان کے لیے موجودہ دنیا میں کوئی مستقبل مقدر نہیں۔

15 جولائی 1986

ابوالبرکات علوی (نظام پور، اعظم گڑھ) دہلی آئے۔ ملاقات کے دوران انھوں نے ایک واقعہ بتایا۔ بابری مسجد کے مسئلہ پر ایک مولانا صاحب نے دھواں دھار تقریر کی۔ تقریر کے دوران انھوں نے بار بار پر جوش طور پر کہا—

بابری مسجد آج خون مانگتی ہے۔

ابوالبرکات صاحب تقریر کے بعد ان سے ملے اور کہا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ درست ہے۔ میں

آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے اپنی تقریر میں کہا کہ بابری مسجد خون مانگتی ہے۔ مجھ کو صرف اتنا اور بتا دیجیے کہ کس کا خون، آپ کے لڑکوں کا، یا قوم کے لڑکوں کا۔ اگر آپ اس کے لیے اپنے لڑکوں کا خون دینے کے لیے تیار ہوں تو اس کے بعد میں بھی اپنے بچوں کا خون پیش کروں گا۔

یہ سن کر مولانا صاحب خاموش ہو گئے اور کچھ دیر کے بعد فرمایا کہ آپ الرسالہ تو نہیں پڑھتے ؟

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ الرسالہ نے پہلی بار قوم کو سوچنے سمجھنے کی طاقت دی ہے۔ آج لوگ باشعور ہوتے جا رہے ہیں۔ جب کہ اس سے پہلے قوم کے پاس بے شعوری کے سوا اور کوئی سرمایہ نہ تھا۔

ہمارے قائدین نے قوم کا ذہن اتنا بگاڑ دیا تھا کہ ہماری قوم سوچنے سمجھنے کی طاقت سے محروم ہو گئی تھی۔ جذباتی ہنگاموں کا نام لوگوں کے نزدیک پروگرام تھا۔ اور جوشیلے اشعار اور لفظی تقریروں کو لوگوں نے اسلامی فکر سمجھ لیا تھا۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے الرسالہ کو نئے انقلاب کا ذریعہ بنایا۔

16 جولائی 1986

17 جولائی 1986 کے اخبارات میں بیک وقت دو خبریں شائع ہوئی ہیں۔ ایک خبر میں نے ٹائمس آف انڈیا (15 جولائی، ص 16) پر دیکھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان کی قومی اسمبلی نے احمد آباد کے فساد میں مسلمانوں کے قتل پر اظہار تشویش کیا۔

دوسری خبر میرے سامنے انڈین اکسپریس (15 جولائی، ص 7) ہے۔ اس میں ایک خبر ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ بنگلہ دیش میں اس وقت تین لاکھ کی تعداد میں بہاری مسلمان ہیں، جنھوں نے بنگلہ دیش کرائسس کے وقت اپنے کو پاکستانی لکھوایا تھا۔ وہ پاکستان جانا چاہتے ہیں، مگر پاکستان ان کو لینے سے انکار کر رہا ہے۔ ان ”بہاری مسلمان“ نے اولاً ہندستان چھوڑا۔ اس کے بعد وہ بنگلہ دیش کی شہریت سے محروم ہوئے اور اب پاکستان میں داخلے کی اجازت سے بھی محروم ہیں۔

ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی زیادتی ہو تو پاکستان کے لوگ زور وشور کے ساتھ اس کی مذمت کرتے ہیں۔ دوسری طرف ان پاکستانیوں کا حال یہ ہے کہ وہ خود مسلمانوں کے ساتھ اس سے زیادہ بڑی بڑی زیادتیاں کر رہے ہیں جو ہندستان کر رہا ہے۔

جب میں اس قسم کی خبریں پڑھتا ہوں تو میرے اندر سخت اشتعال پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بدترین

جرم ہے کہ آدمی خود جس فعل میں مبتلا ہو اسی فعل کے لیے دوسروں کے خلاف چیخ پکار کرے اور اس کو اسلامی اخوت کا نام دے۔ یہ کفر سے بھی زیادہ سنگین چیز ہے۔ کافر کھلم کھلا منکرِ حق ہوتا ہے اور یہ لوگ وہ ہیں جو کافرانہ فعل کرتے ہیں اور اس پر اسلام کا لیبل لگائے ہوئے ہیں۔

17 جولائی 1986

ابو البرکات علوی (پیدائش 1929) دہلی آئے۔ آج انھوں نے اپنا ایک واقعہ بتایا۔ وہ نومبر 1946 میں دیوبند گئے تھے۔ وہاں وہ مولانا حسین احمد مدنی کے مہمان رہے۔

یہ زمانہ وہ تھا جب کہ کانگریس اور مسلم لیگ کا جھگڑا اپنے عروج پر تھا۔ مسلم لیگ کے آدمی مولانا حسین احمد صاحب کی مخالفت کررہے تھے، بلکہ ان کے ساتھ انھوں نے ہر قسم کا ذلت آمیز سلوک بھی کیا تھا۔ اشتعال انگیزی کی یہی فضا تھی جب کہ ابو البرکات صاحب نے دیوبند کا سفر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ مولانا حسین احمد مدنی کے مہمان خانہ میں تھے۔ مولانا اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اس وقت ایک شخص آیا اور اس نے کہا:

”مولانا، قائد اعظم جناح کا اللہ کے یہاں کیا حشر ہوگا؟“

مولانا حسین احمد مدنی یہ سوال سن کر کچھ دیر چپ رہے۔ پھر فرمایا: ”اگر اس کے ارادے نیک ہیں تو اس کا اجر بھی نیک ہوگا۔ اور اگر اس کے ارادے نیک نہیں ہیں تو اس کا اجر بھی نیک نہیں ہوگا“۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ سخت ترین اختلاف کی حالت میں بھی مومن کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔ مومن اللہ سے ڈرنے والا انسان ہے۔ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے اور اس کے ہر قول و فعل کا اس سے حساب لے گا۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ایک حد پر قائم رہے، وہ ہر حال میں انصاف کی بات کہے۔

مولانا حسین احمد مدنی صاحب مسٹر جناح کے سخت مخالف تھے۔ دونوں کے درمیان تعلقات اشتعال انگیزی کی حد تک خراب ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود جب انھیں مسٹر جناح کے بارے میں بولنا ہوا تو وہ عبدیت کے دائرے میں رہ کر بولے۔ اپنے ناپسندیدہ شخص کے بارے میں بھی وہ انصاف کی حد سے باہر نہ جا سکے۔

ایک انٹرویو

(زیر نظر انٹرویو کی پہلی قسط الرسالہ جولائی-اگست 2025 میں شائع ہوچکی ہے)

س: آپ کے خیال میں اہل مدارس اور علما بین مذاہبی مکالمے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

ج: میرے خیال میں وہ اس تعلق سے نہایت مرکزی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اس میں مشغول نہیں ہیں۔ مدارس کو غیر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ میل جول کے فائدے کا احساس نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے طلبہ پر منفی اثر بڑنے کے بجائے ان پر مثبت اثر بڑے گا اور اس سے ان کی مذہبیت کو مزید تقویت حاصل ہوگی۔

اس سلسلے میں میں مولانا اشرف علی تھانوی کے ایک شاگرد کا واقعہ سنانا چاہوں گا۔ انھوں نے مولانا سے اپنے لڑکے کی مذہب سے بیگانگی کی شکایت کی۔ مولانا تھانوی نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے اس لڑکے کو عیسائی اسکول میں بھیج دیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور اس کے نتیجے میں وہ لڑکا ایک باعمل مسلمان بن گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں اس لڑکے کو مذہب کے تعلق سے مستقل چیلنج درپیش تھا۔ اس کے عیسائی ساتھی اس سے اسلام سے متعلق سوالات کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس کو اسلام کے متعلق پڑھنا پڑا۔ اسی طرح ان لوگوں نے اس سے نماز کے بارے میں سوال کیا تو اس کے دل میں نماز پڑھنے کا داعیہ پیدا ہوا اور وہ اس کا پابند ہو گیا۔

اس حوالے سے میں خود اپنی ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ تقریباً نصف صدی قبل جب میں لکھنؤ میں تھا، تو میری ایک ہندو اسکالر سے ملاقات ہوئی، جو ملحد تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تاریخ سے ہٹا دیا جائے تو اس سے دنیا کی تاریخ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ میں اس کے اس بیان سے بالکل نہیں بھڑکا۔ اس کے بجائے میں نے اس جملے کو ایک چیلنج کے طور پر لیا۔ اس کے بعد میرے ذہن میں ایک خاص طرح کا فکری عمل شروع ہو گیا۔ مسلمان رسول اللہ کو آخری پیغمبر اور پوری انسانیت کے لیے ایک نمونہ تصور کرتے ہیں۔ مذکورہ شخص کے اس جملے نے مجھے مجبور کیا کہ میں رسول اللہ کے تاریخی رول کا مختلف کتابوں کے حوالے سے مطالعہ کروں۔ اس مطالعہ کا نتیجہ میری کتاب ”اسلام دورِ جدید کا خالق“ کی شکل میں سامنے آیا۔ حقیقت میں

یہ کتاب ایک ملحد شخص کے ساتھ انٹرایکشن کا ثمرہ ہے۔ اگر میری اس شخص سے ملاقات نہیں ہوتی تو میں متعلقہ موضوع کے مطالعہ پر آمادہ بھی نہ ہوتا۔ بہر حال اس حوالے سے میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کے ساتھ اختلاط سے خطرے کا جو تصور ہے، وہ بالکل بے بنیاد ہے۔ جو لوگ اس خطرے کے احساس سے دوچار ہیں، وہ اس چیلنج کی قدر وقیمت کو نہیں سمجھ رہے ہیں، جو اس اختلاط اور میل جول کی دَین ہے۔ یہ میل جول بجائے خود تعلیم ہی کی ایک شکل اور ذریعہ ہے۔ اگر مدارس کے لوگوں کا دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ میل جول ہو تو میرے خیال میں ہندستان میں اس سے ہندو ـ مسلم تعلقات کے باب میں کافی فائدہ حاصل ہوگا۔

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ دوسروں کے ساتھ میل جول کو فروغ دینا علما کی ذمہ داری ہے؟ لیکن اگر علما میل جول میں دلچسپی نہ لیتے ہوں تو؟

ج: میں مدرسوں کو اس کا الزام نہیں دے رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ دوسروں کے درمیان اسلام کا تعارف پیش کرنا یہ باہمی میل جول پر منحصر ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر ہزاروں لوگوں کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں اللہ کا ایک پیغام لے کر مبعوث ہوا ہوں۔ تم لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ تم لوگ میرے بعد اسے پوری انسانیت تک عام کردو (صحیح البخاری، حدیث نمبر 67)۔ چنانچہ اس کے بعد آپ کے اصحاب کی بڑی تعداد تبلیغ وارشاد کے لیے مکہ ومدینہ کو چھوڑ کر اس سے متصل علاقوں میں چلی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ اور مکہ میں اصحاب رسول کی بہت کم قبریں ہیں۔

س: علما کی طرف سے دوسروں کے ساتھ تعامل میں سب سے بڑی رکاوٹ زبان کا مسئلہ ہے۔ علما کی اکثریت اردو کے علاوہ دوسری زبان سے واقف نہیں ہے۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ یہ اس سلسلے کی ایک بڑی مشکل ہے؟

ج: جہاں چاہ وہاں راہ۔ میں نے انگلش اور ہندی خود سے سیکھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر مدارس کے فارغین صحیح عزم سے کام لیں تو وہ بالکل سیکھ سکتے ہیں۔ جب ایک شخص دوسروں سے میل قائم کرتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ اس کی زبان بھی سیکھتا جاتا ہے اور ان کی تہذیب وروایت سے بھی اس کی آشنائی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ (جاری)

ایمان کالباس

وہب بن منبہ (34-114ھ) ایک مشہور تابعی اور جلیل القدر اہلِ علم میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا ایک بامعنیٰ قول کتابوں میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: الْإِيمَانُ عُرْيَانٌ، وَلِبَاسُهُ التَّقْوَى، وَمَالُهُ الْفِقْهُ، وَزِينَتُهُ الْحَيَاءُ (مصنف ابن ابی شیبہ، اثر نمبر 35235)۔ یعنی، ایمان بےلباس ہے، اس کا لباس تقویٰ ہے، اس کا سرمایہ دین کی گہری سمجھ ہے، اور اس کی زینت حیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تینوں صفات ایمان کی بنیادی خصوصیات (features) ہیں۔ یعنی یہ وہ عناصر ہیں جن کے بغیر آدمی کا ایمان نامکمل رہتا ہے۔ جب تک انسان اپنے اندر یہ صفات پیدا نہ کرے، اس کا ایمان محض زبانی دعویٰ ہوگا، نہ کہ حقیقی ایمان۔

اصل یہ ہے کہ ایمان ایک اندرونی کیفیت ہے، اور عمل صالح اس کا ظاہری اظہار۔ جب انسان کے باطن میں ایمان کی سچائی اور پختگی نہ ہو، تو اس کا ظاہری عمل اللہ کی نظر میں ناقص شمار ہوگا، بلکہ بعض اوقات وہ عمل قابلِ ردّ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی حقیقت کو وہب بن منبہ نے ”ایمان کے بےلباس ہونے“ سے تعبیر کیا ہے۔

معاشرتی لحاظ سے اس قول کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ یعنی جو لوگ ایمان کا دعویٰ کریں، لیکن ان میں وہ صفات پیدا نہ ہوں جن کو یہاں تقویٰ، سمجھداری، اور حیا کہا گیا ہے، تو وہ اپنے سماج میں ایسے افعال کے مرتکب ہو سکتے ہیں، جو نہ صرف ان کے اپنے لیے، بلکہ دینِ اسلام کے لیے بھی بدنامی کا باعث ہوں گے۔ کیوں کہ یہ صفات انسان کے لیے برائیوں کے مقابلے میں چیک اینڈ بیلنس کا کام کرتے ہیں، اور ان کو خیر کے عمل پر ابھارتے ہیں۔

ایمان ایک زندہ حقیقت ہے۔ اگر انسان اسے پوری سنجیدگی کے ساتھ دریافت کرے تو یہ اس کے پورے وجود کو ربانی رنگ میں رنگ دیتا ہے (البقرۃ، 2:138)۔ جیسا کہ اصحابِ رسول کے زمانے میں ہوا۔ لیکن اگر ایمان کے اثرات انسان کے کردار، گفتار اور تعلقات میں ظاہر نہ ہوں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ محض ایک بےجان رسم ہے، نہ کہ کوئی حقیقی عمل جو انسان کے اندر گہرا انقلاب برپا کردے اور ایک عام انسان کو اعلیٰ انسان میں بدل دے۔ (مولانا فرہاد احمد)

خبرنامہ اسلامی مرکز — 286

- دوحہ انٹرنیشنل بک فیئر (8 تا 17 مئی 2025) قطر کی راجدھانی دوحہ میں منعقد ہوا۔ اس میں گڈورڈ بکس نے شرکت کی۔ ادارے کی جانب سے مولانا محمد یعقوب عمری اور مولانا سید اقبال احمد عمری نے اسٹال کا انتظام سنبھالا، جب کہ قطر میں مقیم مولانا عبدالباسط عمری مقامی طور پر شریک ہوئے۔ میلے میں آنے والے زائرین اور مختلف این جی او کے نمائندوں کو قرآنِ کریم کے تراجم اور دینی لٹریچر مختلف زبانوں میں پیش کیا گیا، جسے سب نے شکریے کے ساتھ قبول کیا۔ یہ سفر نہایت مفید، امید افزا، اور نتیجہ خیز ثابت ہوا۔
- 79 ویں یومِ آزادی (15 اگست 2025) کے موقع پر نیشنل میڈیکل کالج، سہارنپور میں ایک پروگرام منعقد ہوا، جس کی صدارت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد اسلم خاں نے کی۔ اس میں ضلع کی ممتاز شخصیات نے شرکت کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں ڈاکٹر اسلم نے روحانیت، اخوت، اور اچھی قیادت کی اہمیت پر زور دیا۔ آخر میں مولانا وحید الدین خاں کی کتابیں مہمانوں کو پیش کی گئیں اور ڈاکٹر اسلم نے تمام معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔
- 18 اگست کو CPS انٹرنیشنل، دہلی کا ایک وفد ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، علیگڑھ کے دورے پر گیا، جہاں ادارے کے ذمہ داران اور ریسرچ اسکالرس کے ساتھ ایک علمی نشست میں فکری تبادلۂ خیال ہوا۔ وفد میں مولانا سید اقبال احمد عمری، مولانا محمد یعقوب عمری، مسٹر وکرانت ڈاگر اور مسٹر بلال شفیع شامل تھے۔ اجلاس میں دورِ حاضر میں حکمت، اجتہاد، اور اتحادِ امت جیسے اہم موضوعات پر گفتگو کی گئی۔ اس پروگرام میں ریسرچ اسکالرس کے علاوہ، ادارہ کے جوائنٹ سکریٹری انجینئر آفتاب حسن، مولانا کمال اختر قاسمی (رفیقِ ادارہ)، وغیرہ شامل ہوئے۔ مولانا نعمان بدر فلاحی (رفیقِ ادارہ) کے اختتامی کلمات پر اس پروگرام کا اختتام ہوا۔
- جامعہ ہمدرد، دہلی کے ایم اے اسلامیات کے طلبا نے سی پی ایس انٹرنیشنل نئی دہلی کے تحت چند ہفتوں پر مشتمل ایک انٹرن شپ پروگرام مکمل کیا، جس کا اختتام 19 ستمبر 2025 کو سی پی ایس انٹرنیشنل، نئی دہلی میں ہوا۔ اس پروگرام میں طلبہ کو یہ رہنمائی کی گئی کہ موجودہ دور میں اسلام پر عمل کرنے کے معاملے میں ہم کہاں غلطی کر رہے ہیں، اور اس کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے کا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف موضوعات پر پریزنٹیشنز پیش کیے، جن میں خواتین اور اسلام، معرفت، اسلام اور امن، اور خدارخی زندگی سمیت دیگر موضوعات شامل تھے۔
- 30 ستمبر 2025 کو سی پی ایس انٹرنیشنل دہلی کی ٹیم کو ودیا جیوتی انسٹی ٹیوٹ آف ریلیجس اسٹڈیز نئی دہلی نے مدعو کیا۔ مسٹر رجت ملہوترا اور مولانا فرہاد احمد، وغیرہ نے شرکت کی۔ ان کے سامنے درج ذیل موضوعات پر خطابات پیش کیے گئے: قرآن، مولانا وحید الدین خاں کی تعلیمات برائے پُرامن دنیا، اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے لیے ایک بہترین نمونہ۔ یہ خطابات مذہبی مطالعات کے طلبہ کے سامنے دیے گئے تھے۔ لکچر کے

بعد سوال وجواب کا سیشن ہوا۔ آخر میں طلبا کو انگریزی ترجمہ قرآن اور مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتابیں بطور تحفہ پیش کی گئیں۔

- We sincerely thank you for providing us with the Paighambar-e-Inquilab books, which were instrumental in the success of our recent Seerat Quiz Competition. By the grace of Allah and with your valuable support, the program attracted over 400 participants. It proved to be an incredibly inspiring and educational experience for everyone involved. We are receiving overwhelmingly positive feedback from both participants and attendees. What was truly uplifting was that even those who usually don't engage with Seerah literature were motivated to read the book because of the quiz format. Participants came not only from Rampur but also from places like Moradabad, Khatoli, and Hapur. In fact, my own relatives from various cities now want to organize similar events in their own towns. People are already expressing their hope for this event to become an yearly tradition, *Alhamdulillah*. Looking ahead, we are planning two more impactful programs, *inshaAllah*: one based on the book *Raaz-e-Hayat* and another major initiative on *Mazhab aur Jadeed Challenge*. These upcoming efforts will have an even wider reach and more ambitious goals, in-sha-Allah. We humbly ask CPS to continue supporting us in these future endeavors as well. Your help plays a vital role in spreading beneficial knowledge and creating interest in meaningful reading among our youth. Warm regards, (Anas Nadeem, Al-Khidmat Foundation, Rampur)

- نئی کتابیں: مولانا وحید الدین خاں صاحب کے مضامین پر مشتمل دو نئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں:

(1) حکمت اختلاف، ضرورت، اہمیت اور دائرۂ کار

(2) وطن سے محبت، اسلامی فکر کی روشنی میں (اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں بھی شائع ہو چکا ہے)

The Spirit of Patriotism: Love for Country that Embraces All Identities

- اس کے علاوہ مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کچھ کتابوں کے ترجمے انگریزی میں ہو چکے ہیں:

(1) دینِ انسانیت (The Religion of Humanity)

(2) نشری تقریریں (Message on Air)

(3) کتابِ زندگی (The Book of Life)

(4) تعمیر حیات (Building Life)

(5) تعبیر کی غلطی (The Error of Political Islam)

ख़ुदा के हुक्म के आगे झुक जाना

तायफ़ के क़बीले सक़ीफ़ का एक ख़ानदान बनू अम्र बिन उमैर था और मक्का के क़बीले बनू मख़ज़ूम का एक ख़ानदान बनू मुग़ीरा। इन दोनों ख़ानदानों में जाहिलियत (इस्लाम से पहले) के ज़माने में सूदी लेनदेन का मामला चलता था । मक्का की फ़त्ह के बाद दोनों ख़ानदान इस्लाम लाए तो उस वक़्त बनू अम्र बिन उमैर ने बनू मुग़ीरा से अपना बक़ाया सूद मांगा। उसके बाद बनू मुग़ीरा ने आपस में मश्वरा किया और तय किए गए फ़ैसले के मुताबिक़ कहा कि हम इस्लाम लाने के बाद अपनी इस्लामी कमाई से सूद अदा नहीं करेंगे । इस पर झगड़ा बढ़ा । उस वक़्त मक्का में रसूलुल्लाह (सल्ल०) की तरफ़ से अत्ताब बिन उसैद हाकिम थे। उन्होंने रसूलुल्लाह (सल्ल०) को इसकी ख़बर दीः आपने उसके जबाव में क़ुरआन की यह आयत लिख कर भेज दी:

> “ऐ ईमान वालो, अल्लाह से डरो और जो सूद बाक़ी रह गया है उसे छोड़ दो, अगर तुम ईमान वाले हो। अगर तुम ऐसा नहीं करते तो अल्लाह और उसके रसूल की तरफ़ से लड़ाई के लिए सावधान हो जाओ।” (सूरह अल-बक़रह, 2:278-79)।

इस आयत को सुनते ही बनू अम्र बिन उमैर का ज़ेहन बदल गया । उन्होंने कहाः हम अल्लाह की तरफ़ पलटते हैं और बक़ाया सूद को छोड़ते हैं । (तफ़्सीर इब्ने कसीर, जिल्द एक, पेज 249)

दुनिया से भरे हुए और दीन से ख़ाली

हज़रत अबुद दर्दा कहते हैं कि “ऐसा क्यों है कि मैं तुम्हारे पेट खाने से भरे हुए हैं देखता हूँ और इलम (मारिफ़त) से तुम को ख़ाली पाता हूँ।” (जामि’ बयानुल इल्म व फ़ज़लिही, असर संख्या 1036)

हज़रत अली ने कहा, “आप हसन की गवाही नहीं मानते, हालांकि हदीस में है कि रसूलुल्लाह (सल्ल०) ने फरमाया कि हसन और हुसैन (अली के दो बेटे) जन्नत के नौजवानों के सरदार हैं।”

क़ाज़ी शुरेह ने कहा, “वह अलग बात है। दुनियावी मामलों में इस्लाम का उसूल यह है कि पिता के पक्ष में उसकी सन्तान की गवाही विश्वसनीय नहीं।”

हज़रत अली ख़लीफ़ा थे। वह काज़ी को निलम्बित करने का अधिकार रखते थे पर उन्होंने क़ाज़ी के फ़ैसले के आगे सिर झुका दिया और अपना दावा वापस ले लिया। नसरानी यह देखकर हैरान रह गया। वह चीख उठा और बोला,

> “मैं गवाही देता हूं कि यह पैग़म्बरों के आदेश हैं कि अमीरुल मोमिनीन एक आम आदमी की तरह क़ाज़ी की अदालत में आएं और क़ाज़ी उसके खिलाफ़ फ़ैसला करें। मैं गवाही देता हूं कि ख़ुदा के सिवा कोई मा‘बूद (उपास्य) नहीं और मुहम्मद अल्लाह के रसूल हैं।” फिर उसने कहा, “यह ज़िरह सचमुच अली की है। एक बार यह अली के ऊंट से गिर गई थी। और मैंने उसे उठा लिया था।” (हिल्यतुल औलिया, खण्ड 4, पृष्ठ 139)

अब हज़रत अली ने वह ज़िरह उसी व्यक्ति को दे दी और उसको और भी सात सौ दिरहम दिए और उसके बाद वह मुसलमान होकर हज़रत अली के साथ रहा, यहां तक कि सिफ्फ़ैन की लड़ाई में शहीद हो गया।

यह घटना उस उसूल की श्रेष्ठतम मिसाल है कि शासक और आम आदमी दोनों क़ानून की निगाह में बराबर हैं। क़ानून की अदालत में दोनों को समान रूप से उपस्थित होना चाहिए और दोनों के ऊपर कानून का फ़ैसला समान रूप से लागू होना चाहिए।

तिरमिज़ी, हाकिम और अबू नईम ने हज़रत अली के जीवन की एक घटना का वर्णन इस तरह किया है:

हज़रत अली के पास एक ज़िरह (लौह-कवच) थी, जो खो गई थी। एक दिन वह कूफ़ा के बाज़ार की तरफ़ गए। उन्होंने देखा कि एक ईसाई ज़िरह बेच रहा है। पास जाकर देखा तो यह वही ज़िरह थी, जो उनसे खो गई थी।

हज़रत अली उस समय इस्लामी साम्राज्य के ख़लीफा (शासक) थे। वह चाहते तो उसी समय ज़िरह अपने क़ब्ज़े में ले सकते थे लेकिन उन्होंने अपने आपको कानून से ऊपर न समझा। उन्होने नसरानी से कहा, "यह ज़िरह मेरी है तुम इसको लेकर क़ाज़ी (न्यायाधीश) के पास चलो। वह मेरे और तुम्हारे बीच फ़ैसला करेगा। उस समय मुसलमानों के क़ाज़ी शुरैह बिन हारिस थे। दोनों बाज़ार से चलकर क़ाज़ी शुरैह के पास पहुंचे।

शुरैह ने क़ाज़ी की हैसियत से पूछा, "अमीरुल मोमिनीन, आप क्या चाहते हैं?" हज़रत अली ने कहा, "यह ज़िरह मेरी है और मुझे वापस दिलाई जाए।" शुरेह ने नसरानी से पूछा कि "तुम क्या कहते हो ?"

उसने कहा, 'अमीरुल मोमिनीन झूठ बोल रहे हैं। यह ज़िरह मेरी है।"

काज़ी शुरैह ने हज़रत अली से कहा, "महज़ आपके दावे के आधार पर मैं ऐसा नहीं कर सकता कि ज़िरह उससे लेकर आपको दे दूं। आप अपने दावे के पक्ष में सबूत लाइये।"

हज़रत अली ने कहा, "शुरैह का निर्देश सही है।" इसके बाद उन्होंने अपने पक्ष में दो गवाह पेश किए। एक अपने गुलाम क़म्बर को और दूसरे अपने लड़के हसन को क़ाज़ी शुरेह ने कहा कि मैं कनवर की गवाही को तो मान रहा हूं पर मैं हसन की गवाही को नहीं मानता।"

इस्लामी फ़ौज उस समय विजेता की हैसियत रखती थी। उसने चीन जैसे देश के सम्राटों को भी हथियार डालने पर मजबूर कर दिया था, पर जब क़ाज़ी (न्यायाधीश) ने अपना फैसला सुनाया तो इस्लामी फ़ौज के सरदार ने कोई बहस किए बिना उसको मान लिया। उसने तुरन्त फ़ौज को हुक्म दिया कि पूरी फ़ौज समरकंद छोड़कर निकल आए। यह अलग बात है कि इसकी नौबत नहीं आई।

समरकंद के लोगों ने जब देखा कि मुसलमान इतने ज़्यादा उसूल पसंद और न्यायप्रिय हैं तो वे हैरान रह गए। इससे पहले कभी उन्होंने ऐसा निष्पक्ष न्याय नहीं देखा था। उन्होंने महसूस किया कि मुस्लिम फ़ौज का आना उनके लिए शुभ है। और यह रहमत का आना है। उन्होंने अपनी मर्ज़ी और ख़ुशी से मुस्लिम हुकूमत को स्वीकार कर लिया। वह कह उठे: स्वागत है। हम आपके प्रशंसक, आज्ञाकारी और फ़रमाबरदार हैं।

यह घटना न्याय और इंसाफ़ का जो नमूना पेश कर रही है, उसकी मिसाल पूरे इतिहास में मुश्किल से मिलेगी। इस घटना में न्याय का उसूल अपने सर्वश्रेष्ठ रूप में और चरम सीमा पर है।

इंसाफ़ और न्याय बेशक श्रेष्ठतम मानवीय मूल्य हैं और यह घटना इस मूल्य (कद्र) के सम्मान की बेहतरीन व्यावहारिक मिसाल है।

जनता और शासक के बीच क़ानूनी बराबरी

हज़रत अली बिन अबी तालिब इस्लाम के चौथे खलीफ़ा थे। उन्हें असाधारण सत्ता प्राप्त थी, पर वह लोगों के बीच एक आम इंसान की तरह रहते थे। न उनका जीवन स्तर दूसरों से अलग था और न उनको दूसरों की तुलना में ज़्यादा कानूनी अधिकार प्राप्त थे।

आपकी पत्नी से कहा कि मसूर की दाल खाते खाते मेरा बुरा हाल हो गया, उन्होंने जवाब दिया, "तुम्हारे खलीफ़ा का भी रोज़ का खाना यही है।" आपसे पहले खलीफ़ा की हिफ़ाज़त के लिए सौ सिपाही तैनात थे। जब आप खलीफ़ा बने तो आपने सबको दूसरे सरकारी कामों में लगा दिया और कहा, "मेरी हिफाज़त के लिए अल्लाह ही काफी है।" यह उस शख्स का हाल था जिसके साम्राज्य की सीमाएं सिन्ध से लेकर फ्रांस तक फैली हुई थीं।

आप की ख़िलाफ़त के ज़माने की एक और घटना है। समरकंद के निवासियों का एक प्रतिनिधि मंडल आपसे मिलने आया। उसने एक फौजी सरदार क़ुतैबा बिन मुस्लिम बाहली के बारे में शिकायत की कि इस्लामी नियम के मुताबिक़ उन्होंने हमको पूर्व सूचना नहीं दी। और हमारे शहर में अचानक अपनी फौजें भेज दीं लिहाज़ा हमारे साथ इंसाफ किया जाए।

समरकंद की विजय हज़रत उमर बिन अब्दुल अज़ीज़ से पहले हुई थी और अब उसके सात साल बीत चुके थे पर आपने इंसाफ के तकाज़े को पूरा करना ज़रूरी समझा। हज़रत उमर बिन अब्दुल अज़ीज ने ईराक के हाकिम को लिखा कि समरकंद के लोगों के मुकद्दमों की सुनवाई के लिए एक विशेष न्यायाधीश नियुक्त किया जाए। इराक के प्रशासक ने तुरन्त आदेश का पालन किया और जमी बिन हाजिर अल बाहली को इसका काज़ी (न्यायाधीश) नियुक्त कर दिया उनकी अदालत में मुकद्दमा पेश हुआ। दोनों पक्षों ने खुलकर अपनी-अपनी दलीलें पेश कीं अन्त में क़ाज़ी (जज) ने समरकंद वालों की शिकायत को सही ठहराते हुए फैसला सुनायाः

> मुसलमानों की फ़ौज समरकंद को छोड़कर बाहर आ जाए। समरकंद वालों को उनका किला और अन्य चीजें वापस कर दी जाएं। इसके बाद इस्लामी क़ायदे के अनुसार मुसलमानों का फ़ौजी सरदार उनके सामने ज़रूरी शर्तें पेश करे। अगर वह तमाम शर्तों को मानने से इंकार कर दें तो फिर इसके बाद उनसे जंग की जाए।

तहक़ीक़ ज़रूरी

रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम अपने सहाबा (साथियों) के साथ बैठे हुए थे, उनमें से एक सफ़वान बिन मुअत्तल थे। इस बीच एक औरत आती है। वह रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम से कहती है कि सफ़वान बिन मुअत्तल मेरे शौहर हैं। जब मैं नमाज़ पढ़ती हूं तो वह मुझको मारते हैं और जब मैं रोज़ा रखती हूं तो मेरा रोज़ा खुलवा देते हैं।

औरत की बात सुनकर पहली नज़र में **वह** सही और उसका शौहर ग़लत दिखाई देता था। लेकिन जब रसूलुल्लाह (सल्ल०) ने शौहर से पूछताछ की, तो असलियत इसके उलट निकली। चूँकि सफ़वान बिन मुअत्तल ख़ुद मौजूद थे, इसलिए आपने **उस** शिकायत के बारे में उनसे भी सवाल किया।

उन्होंने कहा कि ऐ ख़ुदा के रसूल, नमाज़ के लिए मारने की हक़ीक़त यह है कि वह दो-दो सूरतें पढ़ती है, हालांकि इससे मैं उसको मना कर चुका हूं। रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने फ़रमाया कि एक ही सूरः काफ़ी है। फिर सफ़वान ने कहा कि रोज़ा खुलवाने की हक़ीक़त यह है कि वह लगातार रोज़ा रखती है और मैं जवान आदमी हूं, सब्र नहीं कर सकता। रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने फ़रमाया कि किसी औरत के लिए ठीक नहीं कि वह अपने शौहर की इजाज़त के बिना नफ्ल (फ़र्ज़ के इलावा) रोज़ा रखे।

किसी के ख़िलाफ़ शिकायत की बात मालूम हो तो सिर्फ़ सुन कर उसको नहीं मान लेना चाहिए, बल्कि तहक़ीक़ करनी चाहिए। हो सकता है कि तहक़ीक़ के बाद शिकायत ग़लत साबित हो।

न्यायप्रियता

हज़रत उमर बिन अब्दुल अज़ीज़ (62-101 हिजरी) पांचवे खलीफ़ा-ए-राशिद (आदर्श ख़लीफ़ा) हैं। आपके सेवक अबू उमैया कहते हैं कि मैंने एक दिन

से बचते हुए एहतियात के साथ फूल तोड़ो। तुमने एहतियात वाला काम बेएहतियाती से किया, इसी का नतीजा है कि तुम्हारा हाथ ज़ख्मी हो गया।

अब फूल तोड़ने वाला गुस्सा हो गया। उसने कहा कि सारा क़ुसूर तो इन कांटों का है। उन्होंने मेरी हथेली और मेरी उंगलियों से खून निकाल दिया। और तुम उल्टा मुझको मुजरिम ठहरा रहे हो। उसका साथी बोला, मेरे दोस्त, यह पौदे के कांटों का मामला नहीं, यह क़ुदरत की प्रबंधन-व्यवस्था का मामला है। क़ुदरत ने दुनिया की व्यवस्था इसी तरह बनाई है कि यहां फूल के साथ कांटे हों। मेरी और तुम्हारी चीख़ और पुकार ऐसा नहीं कर सकती कि इस व्यवस्था को बदल दे। फूल के साथ कांटे की यह व्यवस्था तो बहरहाल इसी तरह दुनिया में रहेगी। अब मेरी और तुम्हारी कामयाबी इसमें है कि हम इस सच्चाई को मानते हुए इससे बचने की तदबीर तलाश करें। और वह तदबीर यह है कि कांटों से बच कर फूल को हासिल करें। कांटों में न उलझते हुए फूल तक पहुंचने की कोशिश करें।

फूल के साथ कांटे का होना कोई सादा बात नहीं। यह फ़ितरत और क़ुदरत की ज़ुबान में इंसान के लिए सबक़ है। यह प्रकृति की भाषा में इन्सानी हक़ीक़त का ऐलान है। यह उस फ़ितरी मन्सूबे का परिचय है, जिसके मुताबिक़ ख़ुदा ने मौजूदा दुनिया को बनाया है। इसका मतलब यह है कि इस दुनिया में वही क़दम कामयाब होता है जो बच कर चलने के उसूलों के मुताबिक़ हो।

जहां बचने की ज़रूरत हो वहां उलझना, जहां तदबीर की ज़रूरत हो वहां एजीटेशन करना सिर्फ़ अपनी अयोग्यता का ऐलान करना है। ख़ुदा ने जिस मौक़े पर बच कर चलने का तरीक़ा इख़्तियार करने का हुक्म दिया हो, वहां उलझने का तरीक़ा इख़्तियार करना ख़ुद अपने आपको मुजरिम बनाना है। चाहे आदमी ने दूसरों को मुजरिम साबित करने के लिए डिक्शनरी के तमाम अल्फ़ाज़ दोहरा डाले हों।

एक सरदार की ख़ूबियाँ

इब्ने सा‘द ने अब्दुल्लाह बिन अब्बास से रिवायत किया है कि मैंने उमर रज़ि० की इतनी ख़िदमत की कि उनके घर वालों में से भी किसी ने उनकी इतनी ख़िदमत नहीं की। वह मुझको अपने पास बिठाते और मेरी इज़्ज़त करते थे। एक दिन मैं उनके घर में तन्हाई में उनके साथ था। अचानक उन्होंने इतने ज़ोर की आह भरी कि मुझे लगा कि उसी के साथ उनकी जान निकल गई। मैंने पूछा, “क्या आपने किसी डर की वजह से आह भरी है” उन्होंने कहा, “हां,” मैंने कहा, “वह डर क्या है?” फ़रमाया, “मेरे क़रीब आ जाओ।” मैं क़रीब हो गया। फिर फ़रमाया, “इस काम (ख़िलाफ़त) के लिए मैं किसी को नहीं पाता।” मैंने छः आदमियों का नाम लेकर कहा, “क्या आपने फ़ुलां और फुलां के बारे में नहीं सोचा?” मैं एक-एक नाम लेता जाता था और वह हरेक के बार में कुछ न कुछ कहते जाते थे। आख़िर में फ़रमायाः

इस काम का अहल (पात्र) सिर्फ़ वही शख़्स है जो शदीद (कठोर) हो बिना अकड़ के। नर्म हो बिना कमज़ोरी के, सख़ी (दानी) हो बिना फ़िजूलखर्ची के, माल रोकने वाला हो बिना कंजूसी के। (कंज़ुल उम्माल, असर संख्या 14262)

अब्दुल्लाह बिन अब्बास ने कहाः “यह अच्छाईयाँ और खूबियां उमर रज़ि० के सिवा किसी और में जमा नहीं हुईं।

मुजरिम कौन

एक आदमी को गुलाब का फूल तोड़ना था। वह शौक़ के तहत तेज़ी से लपक कर उसके पास पहुंचा और झटके के साथ एक फूल तोड़ लिया। फूल तो उसके हाथ में आ गया, लेकिन तेज़ी के नतीजे में कई कांटे उसके हाथ में चुभ चुके थे। उसके साथी ने कहा कि तुमने बड़ी मूर्खता की, तुमको चाहिए था कि कांटो

सादा पहचान

अनस बिन मालिक रज़ि अल्लाहु अन्हु कहते हैं कि रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने फ़रमाया, “तुम में से कोई सच्चा मुस्लमान नहीं हो सकता जब तक उसका यह हाल न हो जाए कि वह अपने भाई के लिए वही पसंद करे जो वह अपने लिए पसंद करता है। (सही अल-बुखारी, हदीस संख्या 13)।

किसी आदमी के साथ बदज़ुबानी की जाए, तो उसे बुरा लगेगा और उसके साथ नर्म बोल बोले जाएं तो उसको अच्छा लगेगा। इसी निजी तजुर्बे को सामने रखते हुए वह दूसरों से भी बर्ताव करे। वह दूसरों से कड़वे अन्दाज़ में बात न करे, वह हमेशा उनके साथ नर्म अन्दाज़ में बात करे।

अगर किसी को उसका जायज़ हक़ न मिले, तो वह उसे बुरा लगेगा। इसलिए इंसान को चाहिए कि वह दूसरों के हक़ अदा करे और किसी का हक़ मारने से पूरी तरह बचे।

किसी के साथ वादा किया जाए और फिर उसको पूरा न किया जाए तो उसको बेहद तकलीफ़ पहुंचेगी। आदमी इसी से दूसरों के बारे में सबक़ ले। वह किसी से वादा करे तो ज़रूर उसको पूरा करे, वह किसी के साथ वादाख़िलाफ़ी का व्यवहार न करे।

उसको नुकसान पहुंचाया जाए तो उसको फ़ौरन गुस्सा आ जाता है। इस निजी तजु़र्बे को ध्यान में रखते हुए वह दूसरों के बारे में जान ले। वह कभी दूसरों को नुक़सान न पहुंचाए, वह हमेशा यह कोशिश करे कि उससे हमेशा दूसरों को लाभ पहुंचे।

एक सच्चा मुस्लमान बहुत ही हस्सास (संवेदनशील) इन्सान होता है। उसकी संवेदनशीलता उसको मजबूर करती है कि वह दूसरों के हक़ में वैसा ही बने जैसा वह दूसरों को अपने हक़ में देखना चाहता है।

> A fisherman once told me that one doesn't need a cover for a crab basket. If one of the crabs starts climbing up the side of the basket, the others will reach up and pull it back down. (Charles Allen, *The Miracle of Love*)

केकड़े की यह प्रकृति यक़ीनन ख़ुदा ने बनाई है। दूसरे शब्दों में केकड़े का यह तरीक़ा एक ख़ुदाई तरीक़ा है। केकड़े की मिसाल से ख़ुदा इन्सानों को बता रहा है कि उन्हें सामूहिक ज़िन्दगी को किस तरह चलाना चाहिए।

सामूहिक ज़िन्दगी में एकता की बेहद अहमियत है और एकता क़ायम करने का बेहतरीन उपाय वही है जो केकड़ों की दुनिया में ख़ुदा ने क़ायम कर रखा है। किसी मानव-समूह के लोगों को इतना चेतनापूर्ण होना चाहिए कि अगर उनमें से कोई शख़्स मतभेद का शिकार हो और अपने समूह से जुदा होना चाहे तो दूसरे लोग उसको पकड़ कर दोबारा अन्दर की तरफ़ खींच लें। टोकरी के लोग अपने एक आदमी को टोकरी के बाहर न जाने दें।

इस्लामी इतिहास में इसकी एक शानदार मिसाल हज़रत सा'द बिन उबादा अन्सारी की है। रसूलुल्लाह (सल्ल०) के देहांत के बाद, ख़िलाफ़त के मुद्दे पर उनमें आपसी मतभेद पैदा हो गया।

ज़्यादातर सहाबी इससे सहमत थे कि क़ुरैश क़बीले के किसी शख़्स को ख़लीफ़ा बनाया जाए। लेकिन सा'द बिन उबादा के ज़ेहन में यह आया कि ख़लीफ़ा अन्सार का कोई शख़्स हो या फिर दो ख़लीफ़ा बनाए जाएं- एक मुहाजिरों में से दूसरा अन्सार में से। लेकिन इतिहास बताता है कि सा'द बिन उबादा के क़बीले के तमाम लोग अपने सरदार की राह में रुकावट बन गए। उन्होंने सा'द बिन उबादा को खींच कर दोबारा टोकरी में डाल लिया और उनको उससे बाहर जाने नहीं दिया।

एक व्यक्ति ने आपकी आलोचना की, जिससे आपके अहं को ठेस पहुँची और आप भीतर से विचलित हो गए। ठीक उसी समय, रसूल के लाए हुए दीन की ये शिक्षा आपके सामने आती है कि अहंकार न अपनाओ, बल्कि संयम और विनम्रता के साथ लोगों के बीच रहो। अब यदि आपने आलोचना का जवाब विनम्रता से दिया, तो यह पैग़म्बर के लाए हुए दीन पर अमल होगा; लेकिन यदि आपने जवाब अहंकार और घमंड के साथ दिया, तो यह आपका अपनी इच्छाओं का पीछा करना कहलाएगा।

एक व्यक्ति के किसी रवैए से आपको शिकायत पैदा हुई। आप उत्तेजित हो गए। उस वक़्त आपके सामने रसूल (सल्ल०) की लाई शरीअत का यह हुक्म आया कि लोग भड़काएं तब भी तुम सब्र और नज़रअन्दाज़ करने का तरीका अख़्तियार करो। अब अगर आपने उत्तेजना के बावजूद सब्र किया तो आपने पैग़म्बर के लाए हुए दीन पर अमल किया। और अगर आप उत्तेजित होकर उस व्यक्ति से लड़ने लगे तो आपने अपनी इच्छा की पैरवी की।

यही मामला पूरी ज़िन्दगी का है। हर मामला जो आदमी के साथ घटता है, उसमें उसके लिए दो में से एक रवैया इख़्तियार करने का मौक़ा होता है। एक रवैया अपनाने के बाद वह ख़ुदा के यहां ईमान वाला लिख दिया जाता है और दूसरा रवैया इख़्तियार करने के बाद बे-ईमान।

एकता की मिसाल

एक व्यक्ति ने अपना एक अनुभव लिखा है कि एक मछुआरे ने एक बार मुझे बताया कि केकड़े की टोकरी पर किसी को ढक्कन लगाने की ज़रूरत नहीं। अगर उनमें से कोई केकड़ा टोकरी के किनारे से निकलना चाहे तो दूसरे वहां पहुंचते हैं और उसको पीछे की तरफ़ खींच लेते हैं:

किसी पीड़ित या कमजोर व्यक्ति का साथ दिया गया हो, जिससे इंसान की भलाई का उद्देश्य झलकता हो, और जो भलाई तथा सुधार की भावना से कही गई हो।

इसके उलट, बुरी बात वह है जो अपने अहंकार को बढ़ाने, ज़ालिम को ताक़त देने या बुरी नीयत से कही जाए। ऐसी बातें दबे हुए झगड़ों को फिर भड़का देती हैं और आख़िरकार धरती पर फ़साद और अव्यवस्था फैल जाती है।

अल्लाह पर और आख़िरत पर यक़ीन आदमी को संजीदा और ज़िम्मेदार बनाता है। और जो शख़्स सच्चे अर्थों में संजीदा और ज़िम्मेदार हो जाए उसका बोलना वैसा ही हो जाएगा, जिसका उपरोक्त हदीस में ज़िक्र हुआ है।

दो तरीक़े

अब्दुल्लाह बिन उमर रज़ि अल्लाहु अन्हु कहते हैं कि रसूलुल्लाह (सल्ल०) ने फ़रमायाः तुम में से कोई शख़्स ईमान वाला नहीं हो सकता यहां तक कि उसकी इच्छाएं उसके अधीन न हो जाएँ जिसे मैं लेकर आया हूँ। (अल-सुन्नह इब्ने आसिम, हदीस संख्या 15)

इस हदीस से मालूम होता है कि दुनिया में अमल (कर्म) करने के दो तरीक़े हैं। एक है अपनी ख़्वाहिश पर अमल करना और दूसरा है पैग़म्बर के लाए हुए दीन पर अमल करना।

आपके सामने एक हक़ आया। आपके दिल ने गवाही दी कि यह हक़ (सत्य) है। लेकिन इसी के साथ चेतन या अवचेतन रूप से यह एहसास पैदा हुआ कि अगर मैं इस हक़ को मान लूं तो मेरा दर्जा नीचा हो जाएगा। अब अगर आपने हक़ को मान लिया तो आपने पैग़म्बर के लाए हुए दीन पर अमल किया और अगर आपने हक़ का इन्कार किया तो आपने अपनी इच्छा की पैरवी की।

हालत में उसकी अपने दुश्मन से मुठभेड़ हो जाती है। अब अगर जानवर दुश्मन से लड़ाई शुरू कर दे तो उसके आत्म-विकास का काम धरा रह जाएगा। यही वजह है कि हर जानवर दुश्मन से सीधी टक्कर लेने से बचता है, बशर्ते कि वह उसमें मजबूरन पड़ जाए। वह आत्म-विकास के काम को जारी रखने की ख़ातिर टकराव से बच कर निकल जाता है। जानवर तो ये तरीक़ा अपनी फितरत से अपनाते हैं, लेकिन इंसान को इसे अपनी समझ-बूझ से अपनाना पड़ता है।

बोलने की शर्त

अबू हुरैरा रज़ि अल्लाहु अन्हु कहते हैं कि रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने फ़रमाया कि जो आदमी अल्लाह पर और आख़िरत के दिन पर ईमान रखता हो उसको चाहिए कि वह बेहतर बोले वरना चुप रहे। (सहीह अल-बुख़ारी, हदीस संख्या 6019)

जो इंसान अल्लाह की बड़ाई, ताक़त और उसकी महानता को मानता है, और जिसे यक़ीन है कि क़यामत के दिन अल्लाह उसकी हर बात का हिसाब लेगा — वह बोलते समय बहुत संभलकर बोलता है।

यह स्वभाव उसको अपने आप पर नज़र रखने वाला बना देता है। उसकी ज़ुबान पर खामोशी का ताला लग जाता है। वह सिर्फ़ उस वक़्त बोलता है, जबकि बोलना वाक़ई ज़रूरी हो गया हो और जहां सच्ची ज़रूरत न हो वहां वह चुप रहना पसंद करता है।

जो आदमी अपनी मानसिकता के स्तर पर ऐसा बन जाए, उसकी ज़बान जब खुलेगी तो भली बात ही के लिए खुलेगी। बकवास और बेहूदा बात के लिए उसकी जुबान इस तरह बंद हो जाएगी, जैसे उसके पास बोलने के लिए शब्द ही नहीं।

भली बात वह है जिससे कोई ईश्वरीय सच्चाई प्रकट होती हो, जिसमें

शुरूआती रूप (भ्रूण) होता है, अपने मेज़बान जानवर के जिस्म का अन्दरूनी हिस्सा खाता रहता है, यहां तक कि वह लारवा (छोटे बच्चे) की शक्ल ले लेता है। अब यह लारवा बाहर निकलने के लिए ज़ोर करता है। मेज़बान जानवर के लिए यह लम्हा सख़्त कष्टदायक होता है, पर वह एक ऐसे दुश्मन के मुक़ाबले में अपने को बेबस पाता है जो खुद उसके पेट में घुसा हुआ हो। इस तरह लारवा ज़ोर लगाता रहता है, यहां तक कि वह अपने मेज़बान जानवर के जिस्म को फाड़ कर बाहर आ जाता है। यह सारा कुछ इतना ज़्यादा कष्टदायक होता है कि इसके दौरान मेज़बान जानवर मर जाता है।

क़ुदरत के सिखाए हुए जीव-जन्तुओं में बचाव के जो उपाय पाए जाते हैं, वही इन्सान के लिए भी पूरी तरह कारगर हैं। इन्सान के लिए भी अपने दुश्मन के मुक़ाबले में बेहतरीन तरीक़ा यह है कि वह सीधे टकराव से बचे और कतरा कर निकलने की कोशिश करे। दुश्मन को भी यह महसूस करने का मौक़ा न दिया जाए कि आप उसके 'दायरे' में प्रवेश कर रहे हैं। अगर दुश्मन का सामना हो जाए तो उसके मुक़ाबले में अपने को निष्क्रिय और बेजान जाहिर करके अपने को उसकी पकड़ से हटा लिया जाए, अपने दायरे में सिमट कर उसको यह अहसास दिलाया जाए कि मेरी वजह से तुम्हारा किसी किस्म का कोई नुकसान नहीं। इसी के साथ ऐसा उपाय भी किया जाए जिसके ज़रिए संकट की घड़ी में दुश्मन का वार ख़ाली जा सके।

जानवरों ने अपने बचाव के ये उसूल खुद नहीं बनाए, वे उनको ख़ुदा ने सिखाए हैं। इनको ख़ुदाई पुष्टि हासिल है। फिर जानवरों की दुनिया में इस तरह के बचाव व सुरक्षा के तरीक़े 'बुज़दिली' की वजह से नहीं हैं, बल्कि ख़ालिस हक़ीक़त पसंदी (यथार्थवाद) पर आधारित हैं। इसका मतलब यह होता है कि ग़ैरज़रूरी टकराव से बच कर "तामीरे ख़ुद" (आत्म-विकास) के कार्य को जारी रखा जाए। कोई जानवर चारे की तलाश में जा रहा है। कोई अपने जोड़े से मिलने के लिए निकला है। कोई अपना घर बनाने की जद्दो-जहद में लगा है। ऐसी

कर सांकेतिक तौर पर यह ज़ाहिर करते हैं कि यहां से एक तरफ़ तुम्हारा इलाक़ा है और दूसरी तरफ़ मेरा इलाक़ा है। इस दिखावटी या प्रतीकात्मक टकराव के बाद दोनों पीछे की तरफ़ लौट जाते हैं। और इसके बाद दोनों पूरी तरह इस हद के बंटवारे को निभाते हैं। बहुत कम ऐसा होता है कि दो सांड आपस में लड़ जाएं।

3. आप नीली घोड़ी या बीर बहूटी को छुएं तो वह पैर समेट कर मुर्दा-सी बनकर पड़ जाएगी। बहुत से जानवरों के लिए अपने दुश्मन से बचने का यह आसान तरीका है। जब वे देखते हैं कि दुश्मन सिर पर आ गया है और उससे बचना नामुमकिन है तो वे अपने को निष्क्रय और बेजान-सा बना लेते हैं। उनका दुश्मन उनको देखता है पर वह मुर्दा समझ कर उनको छोड़ देता है। वे अपने को मृत ज़ाहिर करके अपने को दुश्मन से बचा लेते हैं और जब दुश्मन चला जाता है तो वह भाग जाते हैं।

4. जानवर बिलों के अन्दर रहते हैं। उनके लिए हमेशा यह ख़तरा होता है कि उनका दुश्मन उनके बिल के अन्दर घुस जाएगा और दुश्मन से वह इस तरह घिर जाएंगे कि बिल के सामने के रास्ते से भाग न सकेंगे। इसलिए बिल वाले जानवर हमेशा अपने बिल में एक पिछला रास्ता (इमरजेंसी गेट) रखते हैं जो संकट के वक़्त काम आ सके। जब भी कोई जानवर देखता है कि सामने के सूराख से उसका दुश्मन घर में घुस आया है तो वे पीछे के सूराख से निकल जाता है और दुश्मन की पकड़ से अपने को बचा लेता है।

5. एक बहुत छोटा कीड़ा है। वह अपने दुश्मन-कीड़े को ख़त्म करने के लिए बहुत दिलचस्प तरीक़ा अपनाता है वह अपने दुश्मन कीड़े के जिस्म में अपना डंक चुभा देता है जो इंजैक्शन की सुई की तरह होता है — यानी नुकीला और अंदर से पोला (खोखला)। वह बहुत फुर्ती से अपने बेहद छोटे अंडे को उसके जिस्म में दाख़िल कर देता है। यह अंडा, जो दरअसल ज़िन्दा बच्चे का

क़ुदरत का सबक़

जानवरों के दो सबसे बड़े मसले हैं- खाना और अपनी हिफाज़त। जानवरों में एक-दूसरे के दुश्मन होते हैं और हर जानवर को हर समय अपने बचाव का ख़याल रखना पड़ता है। जानवरों में बचाव के जो तरीक़े पाए जाते हैं वे इन्सान के लिए भी बहुत अहमियत रखते हैं, क्योंकि जानवरों का तरीक़ा दर-असल क़ुदरत का तरीक़ा है। जानवर जो कुछ करते हैं अपनी स्वाभाविक प्रवृत्ति (natural instincts) के तहत करते हैं। दूसरे शब्दों में वे सीधे क़ुदरत के सिखाए हुए हैं। जानवर सृष्टि की पाठशाला में सीखे हुए विद्यार्थी हैं। उनका अमल या कर्म क़ुदरत का बताया हुआ सबक है। उनके काम करने के ढंग को, पैदा करने वाले की पुष्टि हासिल है। इस सिलसिले में कुछ मिसालें पेश हैं:

1. हाथी और शेर जंगल के दो सब से बड़े जानवर हैं। अगर दोनों में टकराव हो जाए तो यह टकराव दोनों के लिए ख़तरनाक और प्राणघातक होता है। हाथी और शेर दोनों इस सच्चाई से अच्छी तरह वाक़िफ़ हैं। इसलिए वे हमेशा यह कोशिश करते हैं कि एक-दूसरे से कतरा कर निकल जाएं। बहुत ही कम ऐसा होता है कि दोनों यह नौबत आने दें कि उनके बीच सीधे जंग शुरू हो जाए। दो ऐसे दुश्मनों की जंग, जिनमें दोनों में से कोई दूसरे को ख़त्म करने की ताकत न रखता हो हमेशा दोतरफ़ा तबाही पर ख़त्म होती है। शेर और हाथी अपनी पूरी ज़िन्दगी में इस टकराव से बचते रहते हैं.

2. यही मामला सांड का है। दो सांड (भैंसे या बैल) अगर एक दूसरे से लड़ जाएं तो ऐसा बहुत कम मुमकिन है कि एक-दूसरे को खत्म कर दें। सांड ऐसे बेफ़ायदा टकराव से बचने के लिए यह तरकीब करते हैं कि अपनी-अपनी हदें बाँट लेते हैं। दो सांड एक इलाके में पहुंच जाएं तो चलते-चलते जब किसी जगह पर दोनों का सामना होता है तो दोनों एक-दूसरे को सींग मार

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

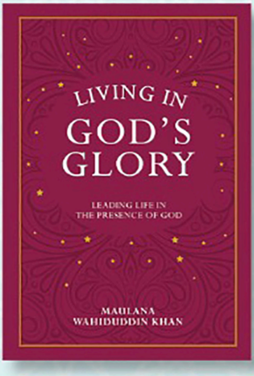

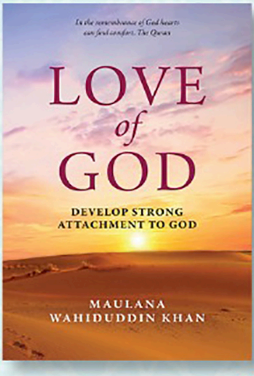

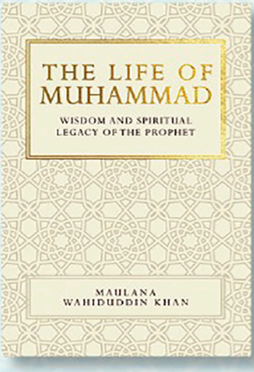

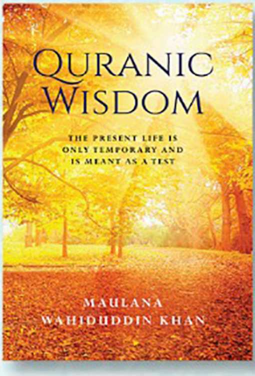

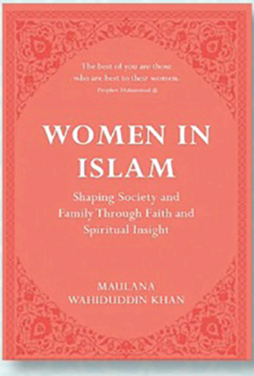

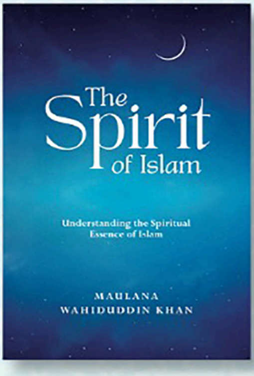

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23